قیمت : -/10 روپے

اپریل 2006

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

رشید حسن خاں

آمد: 10 جنوری 1930 رخصت: 25 فروری 2006

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں شمعیں بجھتی جاتی ہیں

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
Pakistan	Rs. 192	480
Nepal	Rs. 300	588
Bangla Desh	Rs. 132	420
Rest of World	Rs. 300	684

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

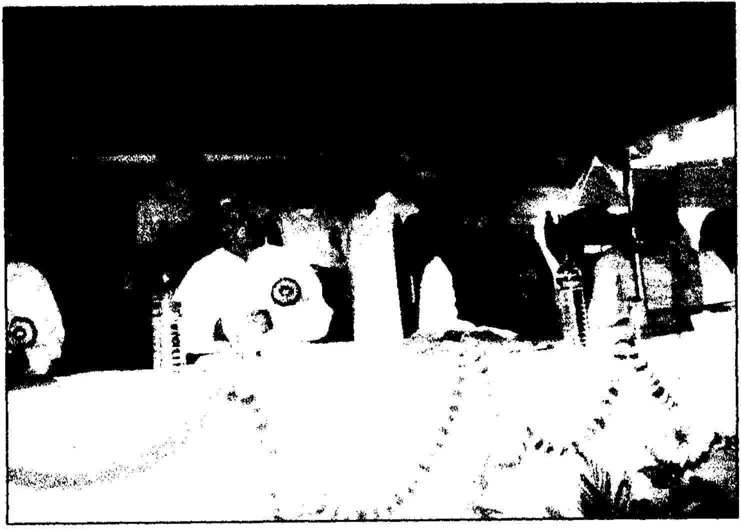

قومی اردو کونسل کی جانب سے 19 تا 21 فروری 2006 ملت کالج دربھنگہ (بہار) میں "فروغ اردو کی نئی حکمت عملی" کے عنوان سے سہ روزہ قومی اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) جناب محمد علی اشرف فاطمی، مرکزی وزیر مملکت برائے ترقی انسانی وسائل، جناب لالو پرساد یادو، مرکزی وزیر ریل اور جناب ایس۔ موہن، ڈائرکٹر انچارج قومی اردو کونسل۔

شمع جلا کر کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جناب محمد علی اشرف فاطمی، ساتھ میں (دائیں سے) جناب ایس۔ موہن، ڈاکٹر ندیم احمد، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور جناب جاوید اقبال، شعبۂ نباتیات، ملت کالج، دربھنگہ (بائیں جانب سب سے آخر میں)۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔4 اپریل 2006

مدیر: ڈاکٹر آر. کے. بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔ 88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 110 066
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، سالار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2
ہماری بات 3

گوشۂ رشید حسن خاں

● رشید حسن خاں — سوانحی خاکہ .... اطہر فاروقی 4
● ممتاز محقق اور متنی نقاد — رشید حسن خاں .... خلیق انجم 8
● رشید حسن خاں — رفیق اور دوست .... قمر رئیس 11
● یہ جو اپنے خاں صاحب ہیں نا! .... صدیق الرحمٰن قدوائی 13
● رشید حسن خاں — باتیں ہماری یاد رہیں .... مخمور سعیدی 15
● خاں صاحب .... اسلم پرویز 18
● رشی [illegible] .... اشفاق محمد خاں 22
● خدائے تدوین .... گیان چند جین 25
● رشید حسن خاں — ایک منفرد محقق .... تنویر احمد علوی 31
● کچھ اصول تحقیق کے بارے میں .... رشید حسن خاں 35
● پہیلیوں سے متعلق چند باتیں .... رشید حسن خاں 38

روبرو

● ساجدہ زیدی سے گفتگو .... مشتاق صدف، فیروز عالم 43
● سکندر احمد سے گفتگو .... اسد ثنائی 48

ہماری مطبوعات سے

● مطالعۂ شعر .... مسعود حسین 52

طلبہ کے لیے

● اردو ادب (کوئز) .... احمد کفیل 57
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-33) .... ارشاد حسین فاروقی 61
اُردو خبر نامہ .... ادارہ 62
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 74

بچوں کا گوشہ

● جگدیش چندر بوس .... جے شری پلائی 78

آپ کی بات

- **زبیر احمد بھاگلپوری۔۔۔ شعبۂ اردو، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ۔ 10**

مسرت کی بات ہے کہ 'اردو دنیا' کی تابانی میں آپ کے زیر ادارت بھی اضافہ ہی ہوا ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں بھی یہ عمل جاری رہے گا۔ مشمولات کے حوالے سے ایک ناقص مشورہ یہ ہے کہ مقالات کے کالم میں ''اردو دنیا'' سے متعلق ہی مضامین شائع ہوں تو بہتر ہے۔ گاہے گاہے اس میں عام معلوماتی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جو ناچیز کے خیال میں اس رسالے کے تشخص کے لیے سودمند نہیں۔ دوسری بات یہ کہ طلبہ کے کالم کے تحت جو بھی مسابقتی مضامین شائع ہوں، ان کے ساتھ متعلقہ تصاویر بھی شائع کی جائیں تو یہ کالم کہیں زیادہ موثر ہوگا۔

ہماری کوشش ہے کہ "اردو دنیا" کے قارئین کو ہر موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرائیں اس لیے اس میں ادب، تعلیم، تاریخ، سماجیات اور معاشیات کے موضوع پر پابندی سے مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

- **رئیس اعظمی۔ رئیس ہومیو کلنک، مبارک پور، اعظم گڑھ (یو.پی.)**

فروری 2006 کا شمارہ دلچسپی سے پڑھا ''ہماری بات'' میں ساتویں اردو کتاب میلہ کی تفصیل پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ 22 لاکھ کی کتابوں کی فروخت قابل اطمینان ہے۔ جب کہ عام خیال یہ تھا کہ یہاں اردو کی صورت حال مایوس کن ہے۔ ''زبان اور تعلیم'' کے تحت ''اردو تھیسارس' بہت ہی عمدہ مضمون ہے۔ شہاب الدین انصاری کا شکریہ کہ بالغۂ روزگار کا تعارف کرایا۔ ''قاتل فلو کی دستک'' بھی بہت اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ فلو کا امکان ونقصان اور علاج کے طریقوں کی بہترین جانکاری ملی۔ کلدیپ شرما کا مقالہ ''اسٹیم خلیوں کا کرشمہ' بہت مفید ہے۔ ڈاکٹر رئیس احمد کا ترجمہ بڑا سلیس اور تسلسل آمیز ہے۔ ''معذور انسان اور کامیاب شخصیت' پڑھ کر امید ہے کہ لوگوں میں تحریک پیدا ہوگی۔

- **غزالہ نگار، کاشانۂ شفیق، ملارنا ڈونگر سوائی مادھوپور، راجستھان 322028**

اردو دنیا کا تازہ شمارہ مارچ 2006 موصول ہوا۔ اداریے میں آپ نے صدر جمہوریۂ ہند کے خطاب کو موضوع بنایا ہے۔ صدر محترم کے خیالات ہمارے لیے مشعل راہ سے کم نہیں۔ 'روبرو' میں بیدار بخت سے کی گئی فیروز عالم کی گفتگو خوب ہے۔ گفتگو کے آغاز میں بیدار بخت کے اجمالی تعارف سے ان کی ادبی فتوحات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے بلاشبہ موصوف کی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

زبان اور تعلیم کے تعلق سے ساجدہ زیدی اور محمد حسن فاروقی کے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ حصہ آپ کے جریدے کا سب سے اہم جزو ہوتا ہے۔ سائنس اور ساجیات کے موضوع پر اسعد فیصل فاروقی، اسپر دھا اور ناصرالدین کے مضامین عہد حاضر کا آئینہ ہیں۔ اسپر دھا کے ہندی مضمون ''حکم، میرے آقا'' کا ترجمہ اظہار احمد ندیم نے خوبصورتی سے کیا ہے اور ناصرالدین کے مضمون ''کم ہوتی بیٹیاں''، کا ترجمہ بھی رواں اور سلیس ہے۔ جس کے لیے مترجم ڈاکٹر خان شاہد وہاب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس طرح کے مضامین کی اشاعت اردو دنیا، کے دامن کو وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں سے بھی قارئین کو ہم آہنگ کرتی ہے۔

ادب کے حصے میں ''میر کلو کی گواہی'' (انجم مانپوری) بہترین انتخاب ہے۔ اس طرح کی غیر معروف مگر نہایت اہم کہانیوں اور افسانوں کی مکرر اشاعت ان فن کاروں کے لیے مناسب ترین خراج عقیدت ہے جو ادبی سیاست کے شکار ہو کر گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔ تبصرہ وتعارف میں ہندی زبان کے مشہور ناول نگار کملیشور کے ناول 'کتنے پاکستان' پر ڈاکٹر فیروز عالم کا تبصرہ سیر حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ عالمانہ ہے۔ تبصرے میں بطور مثال پیش کیے گیے اقتباسات کے مطالعے سے ناول کے اردو مترجم ڈاکٹر خورشید عالم کی ترجمہ نگاری کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ ''حرف آبدیدہ'' رزاق افسر پر احمد کفیل کا تبصرہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ تبصرے کے مطالعے سے مبصر کی شعر فہمی اور گہرے مطالعے کا علم ہوتا ہے۔ آخر میں 'الو کی اداسی' بھی مزہ دے گئی۔

- **عبدالرحمن ڈار، ہیرو لینڈ پبلک اسکول، واکورہ گاندربل، کشمیر۔**

''اردو دنیا' پوری آب وتاب کے ساتھ آسمان صحافت پر اپنی پہچان کو قائم رکھے ہوئے ہے یہ رسالہ اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے سلسلے میں اپنا کردار مثبت طریقے سے ادا کر رہا ہے۔ دنیا بھر میں اردو زبان اور تعلیم سے متعلق جو بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں ان سے یہ رسالہ برابر واقف کروا رہا ہے۔ رسالے کا ایک ایک صفحہ ذہن وروح کو جلا بخشتا ہے اور اپنے قارئین کو اجالوں کی سمت لے جاتا ہے۔

□□□

ہماری بات

رشید حسن خاں کا گذشتہ 25 فروری کو انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کے ساتھ ہی تدوین و تحقیق کا وہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا جسے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے سلسلے کی آخری کڑی کہا جاتا تھا اور جس نے صحیح معنوں میں ایک محقق اور مدون متن کے فرائض انجام دیے۔ رشید حسن خاں کی پوری زندگی کلاسیکی متون کی تدوین میں صرف ہوئی اور انھی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ آج باغ و بہار، فسانۂ عجائب، سحر البیان، گلزار نسیم، دیوان درد، کلیات جعفر زٹلی اور مثنویات شوق کے معتبر متون مع اعراب دستیاب ہیں۔ ان کی تدوین کردہ کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعراب اور حواشی ہیں جن کی مدد سے ان کا متن پڑھنا اور سمجھنا بے حد آسان ہو گیا ہے۔ طلبہ اور محققین دونوں کے لیے یہ کتابیں گنج ہائے گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق اور تدوین متن کے جو اصول بنائے، خود بھی ان پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ انھوں نے تحقیق کے ضمن میں نہ کبھی مصلحت پسندی سے کام لیا اور نہ کبھی شخصی تعلقات کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ جب علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد شائع ہوئی تو انھوں نے اس پر ایک بے لاگ تبصرہ لکھا جو رسالہ ''تحریک'' دہلی میں شائع ہوا۔ اس تبصرے میں انھوں نے اس کتاب کی بے شمار اغلاط کی گرفت کی۔ اس تبصرے کے بعد کافی ہنگامہ ہوا اور کتاب کی کاپیاں دکانوں سے واپس منگائی گئیں اور آخرش یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے وہ پروجیکٹ ہی بند کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے دیوان غالب مرتبہ مالک رام پر تبصرہ کیا اور اس کی کمیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی متون کی تدوین و ترتیب کے طریقۂ کار پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے جو کلاسیکی متون مدون و مرتب کیے ان میں ان اصولوں پر پوری طرح عمل کیا۔ تحقیق کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ ''میں صاف، سادہ اور دو ٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے۔ مجھے شخص سے دلچسپی نہیں، اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دلچسپی ہے۔ جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے۔ میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔''

رشید حسن خاں 10 جنوری 1930 کو شاہجہاں پور (یو. پی.) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سب انسپکٹر تھے۔ رشید حسن خاں نے مدرسہ بحرالعلوم شاہجہاں پور میں تعلیم حاصل کی مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے اور ایک آرڈی ننس فیکٹری میں ملازمت کرنے لگے۔ بعد ازاں کچھ دنوں تک اسلامیہ اسکول میں درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ خواجہ احمد فاروقی کے ایما پر انھوں نے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنا شروع کیا اور وہیں سے 31 دسمبر 1989 کو سبک دوش ہوئے۔ انھوں نے اردو املا، اردو کیسے لکھیں، زبان اور قواعد، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، انشا اور تلفظ، انشائے غالب جیسی کتابیں لکھیں اور کوئی ایک درجن کتابوں کی تدوین و ترتیب کی۔

رشید حسن خاں نے نہ صرف تحقیقی اور لسانی موضوعات پر قلم اٹھایا بلکہ طلبہ اور نوجوانوں کی تربیت کے لیے بھی تاعمر کوشاں رہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں انھوں نے زبان اور املا کے مسائل پر خطبے پیش کیے اور ابتدائی درجات کے طالب علموں کے لیے کئی کتابیں لکھیں نیز بچوں کے رسائل ''پیام تعلیم'' اور ''امنگ'' میں بھی املا کے موضوع پر قسط وار لکھا۔

اردو والوں نے رشید حسن خاں کی گراں قدر علمی و تحقیقی خدمات کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا اور مختلف انعامات و اعزازات ان کی خدمت میں پیش کیے گئے جن میں دہلی ساہتیہ کلا پریشد انعام، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (دہلی اردو اکادمی)، امتیاز میر اعزاز، نیاز فتح پوری ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور یو. پی. مہاراشٹر، دہلی اور ہریانہ اردو اکادمیوں کے انعامات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آج خاں صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں ہمیشہ موجود رہیں گی اور شائقین علم و ادب کو رہنمائی فراہم کرتی رہیں گی۔ رشید حسن خاں کو بہتر خراج عقیدت یہ ہوگا کہ انھوں نے تدوین متن اور ادبی تحقیق کے جو اصول و ضوابط بنائے اور معیار قائم کیے ان پر نئی نسل کے محققین آگے بڑھیں اور جو کام ادھورے رہ گئے ہیں انھیں اسی خلوص نیت اور بے لاگ انداز میں پورا کیا جائے جو خاں صاحب کا خاصہ تھا۔

* * *

اطہر فاروقی

رشید حسن خاں — سوانحی خاکہ

نام : رشید حسن خاں
والد کا نام : امیر حسن خاں
تاریخ ولادت : تعلیمی اسناد کے مطابق 10 / جنوری 1930
مقام پیدائش : شاہ جہاں پور (یو. پی.)
مستقل پتا : 167۔ باڑوزئی دوم۔ شاہ جہاں پور (یو. پی.) 242001
ملازمت : مدرسہ فیض عام، شاہ جہاں پور
اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
31 / دسمبر 1989 کو دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

رشید حسن خاں صاحب کے والد میر حسن خاں صاحب ان پرانے لوگوں میں سے تھے جو انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے تھے۔ وہ پولیس میں ملازم تھے اور سب انسپکٹر تھے۔ تحریک عدم تعاون کے زمانے میں اس تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی تھی۔

انھوں نے رشید صاحب کو شاہ جہاں پور کے عربی مدرسہ بحر العلوم میں داخل کرایا، جہاں 1939 تک وہ زیر تعلیم رہے مگر درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور شاہ جہاں پور کی آرڈننس فیکٹری میں کارکنوں کی بھرتی زور شور سے ہو رہی تھی۔ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے، یوں وہ 1939 کے اواخر میں اس فیکٹری میں ایک معمولی ورکر کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ اس فیکٹری میں 1941 کے آخر میں چھپ کر پہلی مزدور یونین بنائی گئی۔ شروع میں یونین کے جلسے گھروں میں میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے سے ہوتے تھے۔ ایک سال کے بعد باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ چند سال کے بعد اس فیکٹری میں یونین کی طرف سے ہڑتال کی گئی۔ یہ پہلی ہڑتال تھی جو اس آرڈننس فیکٹری میں ہوئی تھی۔ یہ 34 دن تک چلی۔ رشید صاحب اس وقت اس یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے دو سال بعد فیکٹری میں چھٹنی ہوئی۔ نکالے جانے والوں کی پہلی فہرست میں ان لوگوں کے نام تھے جو یونین کے سرگرم رکن تھے، ان میں رشید حسن صاحب بھی تھے۔ ان کے بعد وہ شہر کے عربی مدرسہ فیض عام میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے رکھ لیے گئے۔ چوں کہ داڑھی نہیں تھی اور دوسری شعائر کے بھی پوری طرح پابند نہیں تھے، یوں عربی مدرسے کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ اسی زمانے میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں فارسی، عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور ان کو وہاں ملازمت مل گئی۔

اس ملازمت کے سلسلے کا ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ اسلامیہ اسکول کی اس جگہ کے لیے شہر کے ایک عالم اور مرشد بھی امیدوار تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک ایسے شخص کو ملازمت ملنے کا امکان ہے جو کمیونسٹوں کے ساتھ برسوں تک کام کر چکا ہے۔ کمیونسٹ تو دہریے ہوتے ہیں، لازماً یہ شخص بھی بے دین ہوگا۔ شہر کی ایک بڑی مسجد میں انھوں نے بعد نماز جمعہ یہ اعلان کیا کہ یہ شخص جو بے دینوں کے ساتھ رہا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اسلامیہ اسکول میں اس کو جگہ نہیں ملنا چاہیے۔ مگر ان کی مشکل یہ تھی کہ شہر کے سب سے معروف عالم مولوی محمد مجتبیٰ خاں (مرحوم و مغفور) جو رشید صاحب کے استاد بھی تھے، وہ رشید صاحب کے لیے کوشاں تھے۔ یوں مرشد موصوف کی آہ و فغاں بے کار گئی۔ البتہ ان کے اس ''اعلان'' کا اثر یہ ضرور ہوا کہ مینجنگ کمیٹی میں جب یہ معاملہ پیش ہوا اور رائے لی گئی تو صرف ایک ووٹ کی بڑھت سے رشید صاحب کو اسکول کی ملازمت مل سکی تھی۔ مولوی محمد مجتبیٰ خاں صاحب کی کوشش کے نتیجے میں مینجنگ کمیٹی کے چیئرمین خان بہادر فضل الرحمن خاں صاحب غیر جانب دار رہے تھے، ورنہ صورت حال مختلف ہو جاتی۔

فیکٹری کی ملازمت کے زمانے کے بہت سے واقعات رشید صاحب نے مجھے سنائے تھے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ اس فیکٹری میں اس زمانے میں تین شفٹیں آٹھ، آٹھ گھنٹے کی ہوتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ تیسری شفٹ میں جو صبح چھ بجے ختم ہوتی تھی، درمیان میں آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقفہ ہوتا تھا۔ لوگ ذرا آرام کر لیا کرتے تھے۔ رشید صاحب طلسم ہوش ربا کی جلد ساتھ لے کر جایا کرتے تھے اور اسے پڑھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے طلسم ہوش ربا کی دسوں جلدیں (آٹھ اصل جلدیں اور دو بقیہ طلسم ہوش ربا) دو بار مکمل طور پر اسی زمانے میں پڑھی تھیں۔

باقر مہدی کے رسالے ''اظہار'' کے شمارہ 5 (جنوری 1984) میں پہلی بار گوشۂ رشید حسن خاں شامل ہوا تھا۔ اس میں رشید صاحب نے باقر مہدی صاحب کی فرمائش پر اپنے بارے میں لکھا تھا:

"میرے استادوں میں قابل ذکر نام مفتی محمد مجتبیٰ حسن خاں صاحب (شاہ جہاں پوری) مغفور و مرحوم کا ہے جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انھی کا رہا ہے۔ اساتذہ معنوی کی حیثیت سے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا عرشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب اور اصول سیکھے۔ لیکن ان سب سے مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا۔ تشکیک اور خطائے بزرگاں کو بھی خطا ہی سمجھنے کا سبق پہلے نیاز صاحب ہی سے پڑھا تھا۔ ان سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی، متاثر بہت پہلے سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تحقیق کے باضابطہ طالب علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہو گئے تھے وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں۔ اسی لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی۔ رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات کے باوجود) کلیم الدین احمد کی میں بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں، لیکن ان سے بس یہ شکایت ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب گیا ہے اور منافقانہ انداز بیان کے لیے بڑی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ احتشام صاحب سے بہ حیثیت انسان بہت متاثر تھا۔ ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقیدی نگارشات سے کبھی متاثر نہیں ہو سکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملے میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔

مشاغل میں سرفہرست اسپورٹس کو رکھا جانا چاہیے۔ ہاکی خود کھیلی ہے، اس لیے وہ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ اس کھیل میں جو فن کارانہ وقت پسندی ہوتی ہے اس کا میں عاشق ہوں۔ اس کے بعد باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔ میں اب بھی اپنے وقت کا اچھا خاصا حصہ ان کھیلوں کو دیکھنے میں صرف کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی، اور درس نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے کی بہت بڑی آرڈی ننس فیکٹری تھی جس میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنائی گئی اور پھر 34 دن کی ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ میں اس فیکٹری میں 1939 میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اور اب اس یونین کا جوائنٹ سکریٹری بھی تھا۔ اس دوران میں یو. پی. کے بیشتر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمے داروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا اسی قدر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا گیا۔ وہ زمانہ کمیونسٹ پارٹی میں سیاسی انتہا پسندی کا تھا۔ مزدوروں کے مسائل کمیونسٹ پارٹی کے لیے پارٹی کے دائرے کو وسیع کرنے کا وسیلہ بن کر رہ گئے تھے۔ مجھ جیسے ورکر یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارے مسائل دوسرے کے مسائل سے مختلف ہیں اور انھیں مقامی مسائل کے مطابق حل کیا جانا چاہیے، جب کہ لیڈرشپ کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف ایک نعرہ ہم سب سے لگواتے تھے کہ دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ۔ یہ بات ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یونین کے فیلڈ ورکر سیاسی مسائل اور جوڑ توڑ سے بیگانہ تھے۔ جی توڑ کر کام کرتے تھے اور سب کچھ لٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہم کو جو لیڈر ملے تھے وہ اپنے سے اوپر والے لیڈروں کی کٹھ پتلی تھے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ورکر تو نچلے درجے سے نکل کر آیا تھا لیکن اس کا لیڈر اوپر کے طبقے سے نکل کر آیا تھا اور اپنے ساتھ اپنے طبقے کے سارے تضاد لے کر آیا تھا اور انتہا پسندانہ پالیسی نے کام بنانے کے بجائے کاموں کو بگاڑنے کو اپنا نقطۂ نظر بنا لیا تھا کہ اس وقت یہی سیاسی نقطۂ نظر تھا کمیونسٹ پارٹی کا۔

غرض کہ خاص خاص ورکروں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخرکار مجھ ایسے ناآشنائے سیاست کارکن بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رہنماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورت حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔ ترقی پسند تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اسی نے مجھے محفوظ رکھا کیوں کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اردو ادب کے مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حیثیت اور شخصیت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔

میں22,23 سال سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس شخص کی اصل رائے کیا ہے۔ اس کے برخلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے، پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔ خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔ اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور اس میدان میں آ کر مجھے طبعی مناسبت کا اندازہ ہوا۔ لغت، زبان کے مسائل، عروض اور قواعد جیسے موضوعات شروع میں

میرے پسندیدہ موضوع تھے۔ ادبی تحقیق سے بھی تعلق خاطر تھا لیکن کچھ کم۔ 1960 سے اس طرف زیادہ توجہ مبذول ہوئی۔ حافظ محمود شیرانی صاحب کی تحریریں اولین رہنما کی حیثیت سے پیش نظر رہیں اور پھر قاضی عبدالودود صاحب کی تحریروں نے متاثر کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریروں نے بھی عرفان کی نئی روشنی بخشی۔

ادبی تحقیق اور تدوین اب میرے پسندیدہ ترین موضوعات ہیں۔ میں اس تنقید کا قطعاً قائل نہیں جس میں انشائیہ نگاری کا انداز ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں اس تحقیق کو فکرِ شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے پسینے پونچھنے کا انداز ہو چوں کہ حالات نے اب بیشتر افراد کو دنیا داری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے اس لیے تحقیق کا یہ سادہ وصاف انداز ان کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے ''منفی اندازِ نظر'' کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت اور جہالت کو فروغ دیں وہ مثبت اندازِ نظر والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجرانِ ادب کا ہے۔

میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے۔ مجھے شخص سے دل چسپی نہیں، اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دل چسپی ہے، جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے۔ میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔

آج کل علم و ادب میں جس طرح اسیری کے جال بچھائے گئے ہیں، گروپ بندی نے جس طرح دائرے بنائے ہیں اور دانش گاہوں میں جس انداز میں تحقیقی مقالوں کے نام پر کم سوادی کے اعلیٰ ترین نمونے تیار کیے جا رہے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ تحقیق اپنی صاف گوئی اور صاف بیانی کے دائرے کو وسیع کرے۔ سچ واقعتاً کڑوا ہوتا ہے اور تحقیق کا مقصد سچ کی تلاش ہے اس صورت میں اگر تحقیقی نگارشات میں سچ کی تلخی شامل ہو تو اس کی شکایت نہیں کی جانی چاہیے۔ اگر ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کے نام سے ایک کثیر رقم صرف کرنے کے بعد اور بہت دھوم دھڑکے کے ساتھ ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس کو پشتارۂ اغلاط کہنا مناسب ہوگا اور کوئی شخص یہ بتائے کہ یہ کتاب مقالہ نگاروں کی آسان پسندی اور بے پروائی کا شاہکار ہے اور اس کے اندراجات اس قابل نہیں کہ انھیں معتبر قرار دیا جا سکے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بے ایمانی کرنے والے کو تو کچھ نہیں کہنا چاہتے اور اگر کوئی شخص بے ایمان کا پردہ فاش کرے تو اسے منفی اندازِ نظر کی نمائش قرار دینا چاہتے ہیں۔

تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصلی بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا اور کیسے بولا گیا۔ اس ''کیوں'' اور ''کیسے'' کی تلاش اور وضاحت بھی تحقیق کا ایک مقصد ہے اور یہ میرا محبوب موضوعِ سخن ہے اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تحقیق کا بڑا مقصد ہے حقائق کی تلاش اور ان سے اخذ نتائج، اور یہ میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔''

مطبوعات

1. اردو املا: ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، 1974
2. اردو کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1975
3. زبان اور قواعد (لغت، تلفظ، اور قواعد شاعری) ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی اشاعت اول 1974، اشاعت ثانی، 1983
4. ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ: اشاعت اول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1978۔ اشاعت ثانی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ تیسری اشاعت: لاہور، 1989
5. تلاش وتعبیر (تنقیدی مضامین): (دلّی اردو اکادمی کی اعانت سے)، 1988
6. تفہیم: (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1993۔
7. انشا اور تلفظ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
8. عبارت کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
9. انشائے غالب: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
10. فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1990 انجمن ترقی اردو، لاہور، 1990
11. باغ و بہار: (تدوین) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1992 انجمن ترقی اردو، لاہور، 1992
12. مثنوی گلزارِ نسیم: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1995
13. انتخاب ناسخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
14. انتخاب سودا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
15. انتخاب شبلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
16. انتخاب نظیر اکبرآبادی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1970
17. انتخاب مراثی انیس و دبیر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1921
18. دیوان خواجہ میر درد: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
19. مثنویات شوق لکھنوی (تدوین) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی
20. غرائب اللغات (تدوین)
21. زٹل نامہ (کلیات جعفر زٹلی) انجمن ترقی اردو ہند) نئی دہلی، 2003

22. مصطلحات ٹھگی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 2002
23. کلاسیکی ادب کی فرہنگ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 2000
24. مثنویات شوق، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1998

انعامات واعزازات

1. دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ	1977
2. یو. پی. اردو اکیڈمی انعام	1978
3. غالب ایوارڈ	1979
4. امتیاز میر اعزاز (میر اکیڈمی لکھنؤ)	1980
5. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی)	1989
6. نیشنل ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی	1990
7. محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور)	1990
8. کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (دہلی اردو اکادمی)	1991
9. نیشنل حالی ایوارڈ، (ہریانہ اردو اکادمی)	1992
10. یو. پی. اردو اکادمی انعام	1994

مختلف اداروں میں اصول تحقیق، صحت املا: مشرقی شعریات، قواعد زبان اور قواعد شاعری لکچر

1. اصول تحقیق پر	پانچ لکچر	شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی (24 فروری سے 28/فروری 1984)
2. مشرقی شعریات پر	چھ لکچر	شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی
3. مشرقی شعریات پر	تین لکچر	جواہر لال نہرو یونیورسٹی
4. اصول تحقیق پر	تین لکچر	جواہر لال نہرو یونیورسٹی
5. اصول تدوین پر	تین لکچر	جواہر لال نہرو یونیورسٹی
6. مشرقی شعریات پر	تین لکچر	شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی
7. کلاسیکی ادب کی تفہیم پر	تین لکچر	تین لکچر شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی
8. تصوف اور تحقیق پر	ایک لکچر	اورینٹل کالج، لاہور، 1992

- ○ انٹرنیشنل نیاز سیمینار (کراچی) 1984
- ○ تین سو سالہ جشن یادگار شاہ سراج اورنگ آبادی (اورنگ آباد)
- ○ شیرانی سیمینار، خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ)
- ○ اصول تدوین سیمینار خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ)
- ○ چکبست سیمینار، مہاراشٹر اردو اکیڈمی (بمبئی)
- ○ دکنی ادب سیمینار، بمبئی یونیورسٹی، (بمبئی)
- ○ نصاب تعلیم سیمینار، دہلی اردو اکادمی، دہلی
- ○ عوامی ادب سیمینار، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
- ○ اصناف ادب سیمینار، دہلی اردو اکادمی، دہلی
- ○ دلّی والے، دہلی اردو اکادمی دہلی
- ○ فانی سیمینار، الہ آباد
- ○ نیاز سیمینار، یو. پی. اردو اکادمی، لکھنؤ
- ○ سیماب سیمینار، سینٹ کالج، آگرہ
- ○ جوش سیمینار، شیعہ کالج، لکھنؤ
- ○ جوش سیمینار، یو. پی. اردو اکادمی، لکھنؤ
- ○ انٹرنیشنل غالب سیمینار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی
- ○ دکنی ادب سیمینار، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی
- ○ انٹرنیشنل املا سیمینار، شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی (10 دسمبر سے 13 دسمبر تک)
- ○ مولانا آزاد سیمینار، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
- ○ مولانا آزاد صدی تقریبات سیمینار، یو. پی. اردو اکادمی، لکھنؤ

املا ورک شاپ صدارت کی

1. یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے تین ہفتے کا تربیتی کورس
شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں: یکم جنوری سے 21/جنوری 1981 تک
2. ہائر سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے دس دن کا تربیتی کورس (صحت املا)
کرناٹک آرٹس کالج، دھارواڑ، کرناٹک یونیورسٹی۔ 11/نومبر سے 22/نومبر 1982 تک
3. پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحت املا کا تربیتی کورس۔ علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی ہبلی، کرناٹک۔ 27/مئی سے 3/جون 1983 تک۔
4. پرائمری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحت املا کا پانچ دن کا تربیتی کیمپ، دھارواڑ، زیر اہتمام کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور۔ 1985
5. اردو املا کی معیار بندی پر تین روزہ سیمینار۔ اردو ٹیچنگ ریسرچ سینٹر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (حکومت ہند) لکھنؤ 28/دسمبر سے 30 دسمبر 1987 تک۔

وزٹنگ فیلو

1. شعبہ اردو جموں یونیورسٹی، تین ہفتے کے لیے بہ حیثیت وزٹنگ فیلو:
اصول تحقیق، قواعد زبان اور مشرقی شعریات پر لکچر دیے۔ اپریل 1983
2. شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی میں بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: دو ماہ کے لیے۔
اصول تحقیق، قواعد زبان، قواعد شاعری اور علوم بلاغت پر لکچر دیے۔ فروری۔ مارچ، 1992
3. شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: چار ہفتے کے لیے۔
متن کی قرأت، کلاسیکی ادب کی تفہیم، علوم بلاغت اور اصول املا پر لکچر دیے۔ ستمبر، 1995

(بشکریہ ''کتاب نما'' خصوصی شمارہ — ''رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات'' مرتب: اطہر فاروقی۔ سنہ اشاعت جولائی 2002)

□□□

خلیق انجم

ممتاز محقق اور متنی نقاد — رشید حسن خاں

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف تو بہت سے اہلِ علم نے کیا ہے لیکن اردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ کے لیے انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گزرتا تھا کہ اردو زبان کی بقا، ترقی اور فروغ کے لیے وہ اور کیا کریں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے دلّی یونی ورسٹی میں اس زمانے میں شعبہ اردو قائم کرایا جب اردو کا نام لینے والوں اور اردو کی ترقی کے خواہاں حضرات پر اچھے خاصے سنجیدہ لوگ بھی پاکستانی ہونے کا الزام لگاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس الزام کی کوئی فکر نہیں کی اور دن رات اردو کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ جب وہ دہلی کالج میں ایک استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے تو دہلی یونی ورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو کا مشترکہ شعبہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لے کر وائس چانسلر کو اپنے حق میں کرلیا۔ نیز مجھے، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دوسرے حضرات کو اپنے ساتھ اس کام میں لگایا۔ ہمارا کام یہ تھا کہ خواجہ صاحب کے خطوط لے کر مختلف اراکین پارلیمنٹ اور اس وقت کی مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کے پاس خواجہ صاحب کے خطوط لے کر جاتے۔ خواجہ صاحب ایک عظیم مقصد کے لیے کام کررہے تھے اس لیے انھیں ڈاک پر زیادہ بھروسہ نہیں تھا، متعلقہ حضرات کو خطوط بھیجتے تھے تو وہ ڈاک سے نہیں بلکہ ہمارے ہاتھ بھیجتے تھے۔ خواجہ صاحب کے خلوص، لگن اور زبان و ادب سے بے پناہ محبت اور کچھ کر دکھانے کے جذبے سے ہی دہلی یونی ورسٹی میں اردو کا ایک الگ شعبہ قائم ہوا۔ شعبہ قائم ہوتے ہی خواجہ صاحب نے اردو ادب کی ترقی کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے مثلاً انھوں نے اردو-ہندی کا ایک پروجیکٹ شروع کیا جس میں ہمارے اس عہد کے بہت بڑے عالم اور فارسی داں مولانا ضیا احمد بدایونی کا تقرر کیا۔ اس خیال سے کہ لغت میں اغلاط نہ رہ جائیں، خواجہ صاحب نے ہندی کے دو بڑے اسکالرز کو بھی اس پروجیکٹ میں شامل کرلیا۔ اس اردو ہندی لغت پر خاصا کام ہوچکا تھا کہ خواجہ صاحب ریٹائر ہوگئے اور یہ کام ہمیشہ کے لیے رُک گیا۔ انھوں نے اردو کے کلاسکی ادب کی ترتیب و تدوین کے لیے بھی ایک پروجیکٹ شروع کیا۔ اس پروجیکٹ کے لیے انھیں ایک ایسے اسکالرز کی ضرورت تھی جس میں تحقیقی کام کی صلاحیت ہو اور جو اس پروجیکٹ کو صحیح طرح سے چلا سکے۔ اسی زمانے کی بات ہے، ایک دن خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا: ''آپ رشید حسن خاں صاحب کو جانتے ہیں۔ آپ نے ان کی کون سی تحریر پڑھی ہیں۔''

میں نے کہا کتاب تو ابھی تک غالباً ان کی کوئی چھپی نہیں ہے لیکن ان کے چند مضامین شائع ہوئے ہیں اور ان کے وہ مضامین قابلِ ذکر ہیں جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے ''اردو ادب'' میں شائع ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب نے دریافت کیا کہ ان کی کون سی تحریر آپ کو پسند آئی، میں نے کچھ مضامین کے نام بتائے اور عرض کیا کہ وہ دراصل اس میدان کے آدمی ہیں جس کی الف ب سے بھی میں واقف نہیں ہوں۔ یعنی عروض و قواعد۔ خواجہ صاحب نے پھر پوچھا آپ نے ان کا کوئی مضمون تو پڑھا ہوگا؟

عرض کیا کہ میں نے ان کا مقالہ ''ملائی بالائی'' پڑھا ہے لیکن یہ پتھر اتنا بھاری تھا کہ میں نے اُٹھا کر رکھ دیا۔ خواجہ صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی: ''خواجہ صاحب بہت کم ہنستے یا مسکراتے تھے''

کہنے لگے وہ ایک عالم آدمی ہیں۔ آپ کو ان کے تمام مضامین پڑھنے چاہیں۔ میں خواجہ صاحب کے سنجیدہ لب و لہجہ سے خائف ہوگیا اور بہت ہی سنجیدگی سے عرض کیا دراصل وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں ان میں میری دل چسپی نہیں ہے۔ میرے اس جواب سے خواجہ صاحب کے ماتھے پر بل پڑگیا۔ کہنے لگے کوئی اور یہ بات کہتا تو مجھے برا نہ لگتا۔ مگر آپ کا یہ کہنا مجھے پسند نہیں آیا، آپ ان چند لوگوں میں ہیں جن کے مستقبل سے مجھے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ میں خاموش ہوگیا اور جب خواجہ صاحب کے پاس سے آیا تو لائبریری جاکر رسالوں میں رشید حسن خاں کے جو دو چار مضامین ملے وہ پڑھ ڈالے۔ دراصل مجھے خوف تھا کہ جب بھی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوگی وہ ان مضامین کے بارے میں ضرور پوچھیں گے۔

میں نے جو خاں صاحب کے مضامین پڑھے وہ میرے بہت کم سمجھ میں آئے لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آگیا کہ خاں صاحب بہت عالم آدمی ہیں نیز میں اس موضوع پر خواجہ صاحب سے بات کرنے کے قابل ہوگیا۔ ایک دو ہفتے بعد خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے رشید حسن خاں کے مضامین کا ذکر کیا۔ میں نے اپنی معلومات بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیں کہ خواجہ صاحب خاصے مطمئن ہوگئے۔

کچھ دن بعد میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز یونی ورسٹی کے کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ ہمارے محترم استاد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ایک خوش شکل اور لباس کے اعتبار سے خوش سلیقہ نوجوان کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ ظہیر صاحب اس نوجوان کو لے کر ہماری میز پر آگئے۔ تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں صاحب ہیں اور ہمارے شعبہ اردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ہے۔ دعا سلام کے بعد جب

رشید حسن خاں صاحب بیٹھ گئے تو ظہیر صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ انھیں جانتے ہیں میں نے بتایا کہ خوب جانتا ہوں بلکہ میں تو ان کا زبردست مداح ہوں اور میں نے ان کے سارے مضامین پڑھے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خوف سے میں نے خاں صاحب کے مضامین پڑھ کر جو معلومات حاصل کی تھی وہ ایک ہی سانس میں اُگل دیں۔ رشید حسن خاں صاحب مجھ سے متاثر ہوگئے اور اس دن سے میری ان کی ایسی دوستی شروع ہوئی کہ مرتے دم تک ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے۔

اس مختصری ملاقات میں، میں نے خاں صاحب کا دل جیت لیا۔ اگرچہ میں نے اُن کے مضامین پڑھے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ لکھتے کیا ہیں لیکن دہلی والا ہونے کی وجہ سے گفتگو کے فن پر قدرت حاصل تھی اور بات خاں صاحب سے اس طرح کی کہ خاں صاحب سمجھے کہ واقعی میں نے اُن کے مضامین پڑھے ہیں۔ اُس دن سے لے کر اُن کی وفات تک خاں صاحب سے میرے تعلقات ہمیشہ انتہائی خوشگوار رہے۔ میرے ساتھ اُن کا رویّہ ہمیشہ انتہائی مخلصانہ رہا۔

اُن کے تقرر کے کچھ ہی دن بعد میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دوکان پر بیٹھے تھے۔ اس دوکان کی ادبی اہمیت یہ تھی کہ وہاں بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر آتے تھے اور ہم جیسے نوجوانوں کی ایک تربیت گاہ بھی یہی دوکان تھی۔ یہیں ایک دن میں نے خاں صاحب کو دیکھا۔ اُنھیں گوپال متّل یہاں لے کر آئے تھے۔ گوپال متّل اُن دنوں ’تحریک‘ کے اڈیٹر تھے اور اُنھیں ہر وقت اہلِ علم حضرات کی ضرورت رہتی تھی۔ کسی محفل میں متّل صاحب کی ملاقات رشید حسن خاں صاحب سے ہوگئی اور پھر اُن کے دوستانہ مراسم ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئے۔ یہاں تک کہ گوپال متّل کے دفتر میں جب مے نوشی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، اُن میں خاں صاحب پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ خاں صاحب نے گوپال متّل صاحب کے ماہنامہ ’تحریک‘ میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ چوں کہ قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی سے خاں صاحب کے تعلقات بہت اچھے تھے، اس لیے اُنھوں نے اپنے تعلقات کا استعمال کرکے اُن سے مضامین منگوائے جو ’تحریک‘ میں شائع ہوئے۔

میں ذکر کررہا تھا جب مولانا سمیع اللہ کی دکان کا۔ وہاں ممتاز شاعر اور ادیب جمع ہوتے اور پھر چنڈوخانے چلے جاتے۔ چنڈوخانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک ایسا ریستوراں تھا جہاں ادیب اور شاعر شام کو اکٹھا ہوتے تھے۔ بعض وجوہ سے شاعروں نے اس چائے خانے کا نام چنڈوخانہ رکھ دیا تھا۔ حالاں کہ اس کا اصل نام تھا Friends Tea Stall اور ظہیر نام کے ایک صاحب اس کے مالک تھے۔ شروع شروع میں تو ظہیر صاحب اپنے ریستوراں کا نام چنڈوخانہ سن کر بھڑک اُٹھتے لیکن آہستہ آہستہ اتنے عادی ہوگئے کہ خود بھی اسے چنڈوخانہ کہنے لگے۔

رشید حسن خاں صاحب نے اپنی نسل میں خود سے کم عمر لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اُن میں غالباً ڈاکٹر اسلم پرویز اور میں سرِفہرست تھے۔ خاں صاحب سے دنیا بھر کی باتیں ہوتیں ادبی، سیاسی اور سماجی مسائل پر گفتگو کرتے اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ خاں صاحب جو بالکل روایتی قسم کے محقق تھے، اپنے عہد کے مسائل سے کیسے واقف ہیں؟

اگرچہ ان کی تعلیم دینی مدارس میں ہوئی تھی جہاں استاد اور شاگرد دونوں روایت کے خول میں بند ہوتے ہیں لیکن خاں صاب بہت زیادہ آزاد فکر، روشن خیال اور دور اندیش انسان تھے۔ وہ انگریزی اور اردو کے اخبارات بڑی پابندی سے پڑھ کر سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے۔ اگر چنڈوخانے میں سیاست پر گفتگو ہوتی تو خاں صاحب اپنی رائے مدلل طریقے سے اس طرح پیش کرتے کہ دوسرے لوگوں کو کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہتی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں خاں صاحب کی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات بیان کردوں۔ شاہ جہاں پور میں ایک صاحب تھے امیر حسن خاں۔ یہ خاں صاحب کے والد تھے۔ تعلیمی اسناد کے مطابق خاں صاحب 10 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے۔ مگر اُنھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ اُن کی تاریخ ولادت میں سنہ غلط لکھا گیا ہے۔ یہ سنہ 1930 نہیں 1928 تھا۔

خاں صاحب نے شاہ جہاں کے مشہور عربی مدرسے بحرالعلوم میں داخلہ لیا اور 1939 تک اس مدرسے میں تعلیم پاتے رہے لیکن گھر کے مالی حالات کچھ ایسے خراب ہوئے کہ اُنھیں تعلیم ترک کرکے ملازمت کرنی پڑی۔ اس وقت اُن کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ شاہ جہاں آباد میں قائم آرڈی نینس کلورنگ فیکٹری میں بہت ہی معمولی مشاہرے پر ملازمت کرلی۔ یہ معمولی مشاہرہ بھی غنیمت تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں اُن کے گھر کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ یہاں مزدوروں کا بڑے پیمانے پر استحصال کیا جاتا تھا۔ خاں صاحب نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر مزدوروں کی ایک یونین قائم کی۔ اس یونین کے جلسے میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے فیکٹری کے ملازمین کے گھروں پر ہوتے اور پھر کچھ عرصے بعد یونین کی باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ چند سال بعد یونین نے اس فیکٹری میں ہڑتال کردی جو اپنی نوعیت کی پہلی ہڑتال تھی اور چونتیس سال تک چلتی رہی۔ اس ہڑتال کے محرکوں میں خاں صاحب بھی تھے۔ وہ اس وقت یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس ہڑتال سے ناراض ہوکر فیکٹری کے ذمے داران نے کچھ مزدوروں کو برطرف کردیا۔ چوں کہ خاں صاحب ہڑتال میں پیش پیش تھے، اس لیے اُنھیں بھی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خاں صاحب نے بحرالعلوم میں عربی کا جو علم حاصل کیا تھا وہ کام آیا اور خاں صاحب مدرسۂ فیضِ عام میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔

خاں صاحب پر الزام تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ ایک خدائی فوجدار مولوی صاحب نے شہر کی بڑی مسجد میں اپنے خطبے میں یہ اعلان کیا کہ جو شخص بے دینوں کے ساتھ رہتا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اُسے اس مدرسے میں

ملازمت نہیں ملنی چاہیے۔ مدرسے میں خاں صاحب کے کچھ ہمدرد بھی تھے۔ اُن کی وجہ سے خاں صاحب کو ملازمت سے تو نکالا نہیں گیا لیکن بڑی کلاسیں لے کر انھیں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کام سونپ دیا گیا۔ اس کے بعد خاں صاحب اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازم ہوگئے اور یہیں اُنھوں نے عروض اور قواعد پر کچھ مضامین لکھے، جن کی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی کی اُن پر نظرِ انتخاب پڑی اور خواجہ صاحب انھیں دہلی یونی ورسٹی کے اردو شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر لے آئے۔

یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے سامنے ایک عمارت تھی جس کا نام تھا ٹیوٹوریل بلڈنگ۔ اس میں خاں صاحب کو ایک کشادہ کمرہ ملا، کمرے میں چند الماریاں تھیں جن میں اُن کی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔

خاں صاحب بہت کم گو اور کم آمیز تھے۔ صرف اُن ہی سے ملتے، جن سے اُن کا مزاج ملتا تھا اور ایسے لوگ بہت کم تھے۔ خاں صاحب سازشوں سے دامن بچاتے تھے اور یونی ورسٹیوں کے شعبوں میں سازشوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا، اس لیے خاں صاحب کی زندگی ایک گوشہ گیر فقیر کی سی تھی۔ ہاں، خاں صاحب کو جو لوگ بہت زیادہ پسند تھے وہ تھے ایسے ریسرچ اسکالر جو سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ خاں صاحب اُن کی ہر ممکن مدد کرتے۔ کتابوں کے حوالے دیتے، مسائل پیش کرتے۔ ادیب یا شاعر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے وغیرہ وغیرہ۔ خاں صاحب کو ریسرچ اسکالرز سے اس حد تک قربت حاصل ہوگئی تھی کہ اُن کے بارے میں بعض دشمنوں نے یہ مشہور کردیا کہ دو چار اسکالر کے تحقیقی مقالے اُن ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک نوجوان خاتون کو خاں صاحب سے بہت قربت حاصل تھی۔ اُن کے بارے میں کچھ سنجیدہ حضرات کو بھی یہی یقین تھا کہ اس خاتون کا پی ایچ ڈی کا مقالہ خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

خاں صاحب کی زندگی کے حالات اگر لکھنے بیٹھوں تو سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہوں گے۔ یہاں میں صرف خاں صاحب کی علمی خدمات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا آغاز عروض اور قواعد پر مضامین لکھ کر کیا، جو اس زمانے کے مقتدر ادبی رسالوں اور خاص طور سے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے 'اردو ادب' میں شائع ہوئے۔ خاں صاحب نے زبان اور قواعد پر بہت کچھ لکھا بلکہ اس موضوع پر ایک عالمانہ کتاب بھی لکھی۔ چوں کہ خاں صاحب کا موضوع زبان تھا، اس لیے اُن کی کتابیں 'اردو املا'، 'زبان اور قواعد'، 'انشا اور تلفظ' وغیرہ بہت اہم کتابیں ہیں۔ اُنھوں نے بڑوں ہی کے لیے نہیں نوجوانوں اور چھوٹوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً 'اردو کیسے لکھیں'، 'عبارت کیسے لکھیں' وغیرہ۔

خاں صاحب تحقیق کرتے کرتے تدوین کے میدان میں بھی آگئے۔ اُنھوں نے متنی تنقید کے بنیادی مسائل پر اہم کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس میدان میں اُن کی پہلی کتاب 'فسانۂ عجائب' ہے، جس کی طباعت میں میرا بھی دخل تھا اور انجمن ترقی اردو نے اس عالمانہ کام کو شائع کیا تھا۔ اس کے بعد خاں صاحب نے 'باغ و بہار'، 'مثنوی گلزارِ نسیم'، 'مثنوی سحرالبیان'، اور 'مثنوی شوق لکھنوی' جیسی اہم کلاسیکل ادب کی کتابوں کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے اور یہ سب مولوی عبدالحق سیریز کے تحت انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ خاں صاحب نے 'انتخاب ِ ناسخ'، 'انتخابِ سودا'، 'انتخابِ شبلی'، 'انتخابِ نظیر اکبرآبادی' اور 'انتخابِ مراثی انیس و دبیر' وغیرہ بھی مرتب کرکے شائع کیے۔

خاں صاحب کے جو تنقیدی اڈیشن انجمن سے شائع ہوئے ہیں، وہ سب خاں صاحب نے میری درخواست پر تیار کیے تھے۔ اس سلسلے کی دو کتابیں اور ہیں 'مصطلحاتِ ٹھگی' اور 'زٹلی نامہ'۔ انجمن بعض وجوہ سے یہ کتابیں شائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ سے 'مصطلحاتِ ٹھگی' کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے ادبی کمیٹی سے اس کتاب کے لیے فوراً مالی تعاون منظور کرادیا تو پھر میں نے خاں صاحب کی کتاب 'زٹلی نامہ' کے لیے بھٹ صاحب سے مالی تعاون حاصل کیا۔ میں بھٹ صاحب کا شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے میری درخواست قبول کرلی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور انجمن ترقی اردو کے مالی تعاون سے یہ کتابیں بھی شائع ہوگئیں۔

آج کل خاں صاحب 'گنجینۂ معانی کا طلسم' نام سے ایک کتاب تیار کررہے تھے۔ 'گنجینۂ معانی کا طلسم' ایک قسم کی 'دیوانِ غالب' کی فرہنگ ہے۔ اس میں خاں صاحب نے بتایا ہے کہ غالب نے کون سا لفظ کہاں پر اور کس شعر میں استعمال کیا ہے۔ اب تک اس کتاب کے ساڑھے آٹھ سو صفحات کمپوز ہوچکے ہیں اور ابھی اس کا کافی حصہ باقی ہے۔ میں خاں صاحب کے صاحب زادوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ وہ باقی مسودہ بھی دے دیں۔ مگر انجمن کی ایک مشکل یہ ہے کہ کمپوزنگ خاں صاحب نے پڑھی تھی۔ کیوں کہ وہ کسی اور کی پروف ریڈنگ سے کبھی مطمئن نہیں تھے۔ اب جو صفحات کمپوز ہوں گے اُنھیں کون پڑھے گا اور اگر پڑھے گا تو خاں صاحب کا علم کہاں سے لائے گا۔ پھر بھی میری کوشش ہے کہ یہ کتاب ضرور چھپ جائے اور انشاء اللہ ضرور چھپے گی۔

ایک دفعہ میں نے علامہ اقبال پر سمینار کے لیے ایک مقالہ لکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اقبال کا اردو کلیات ابھی تک صحیح طریقے سے مرتب نہیں ہوا اور ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی عالم اور متنی نقاد اسے ترتیب دے۔ میں نے رشید حسن خاں صاحب سے درخواست کی۔ میں مرحوم کا شکرگزار ہوں کہ اُنھیں یہ کام پسند آیا اور اُنھوں نے کہا کہ میں رفیع الدین ہاشمی صاحب کو بھی تیار کرلوں تاکہ وہ دونوں مل کر یہ کام کرسکیں۔ رفیع الدین ہاشمی صاحب سے درخواست کی، اُنھوں نے بخوشی میری درخواست قبول کرلی۔ ابھی یہ کام ہوہی رہا تھا۔ میں خاں صاحب کو اس سلسلے میں مواد فراہم کررہا تھا اور رفیع الدین ہاشمی صاحب بھی خاں صاحب سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور دونوں یہ کام کررہے تھے کہ 25 فروری 2006 کو خاں صاحب خدا کو پیارے ہوگئے۔

□□□

قمر رئیس

رشید حسن خاں — رفیق اور دوست

ہمارے عہد کے سب سے معتبر محقق رشید حسن خاں بھی رخصت ہو گئے۔

25 فروری 2006 کی رات میں ڈھائی بجے ان پر قلب کا تیسرا حملہ ہوا۔ وہ گھبرا کر اٹھے، قے ہوئی۔ پاس کی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ گھر کے لوگ اٹھ کر آ گئے اور چند منٹ میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ آخری وصیت، طبی مشورے اور معالجے کی مہلت بھی نہ ملی۔ (1) حسبِ عادت دن میں وہ کام کرتے رہے۔ کچھ ملنے والوں سے دیر تک باتیں بھی کیں۔ برسوں سے وہ ایک بڑے پروجیکٹ، ''لفظیات غالب'' پر کام کر رہے تھے۔ کوئی لفظ غالب کے یہاں کب، کہاں، کس سیاق میں، کن معنوں میں استعمال ہوا ہے تقریباً ایسے ایک ہزار نو سو الفاظ انھوں نے جمع کر لیے تھے۔ بہت فخر سے اپنے اس آخری کارنامے کا ذکر کرتے تھے۔ مگر وہ جو شاعر نے کہا ہے:

زندگی اک شمع ہے جلتے ہوئے بجھ جائے گی

اردو املا، زبان و قواعد، تلاش و تعبیر اور کلاسیکی ادبی سرمایے کی بے شمار وقیع کتابوں، جیسے فسانۂ عجائب، انتخابِ ناسخ کے متن کو مثالی صحت اور حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرنے والے اس نامور محقق نے ہندو پاک کی دانش گاہوں کے اساتذہ، طلبہ اور علما کے لیے تحقیق، متنی تنقید اور علمی تلاش و تعبیر کے جو معیار مقرر و متعین کیے ہیں شاید اس میدان میں معاصرین میں کوئی ان کا مقابل اور ہمسر نہیں تھا، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو ہمیشہ انھوں نے اپنے گرو کا درجہ دیا اور ان سے سیکھنے کا اعتراف کیا ہے۔ رشید صاحب مرحوم کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر شناسی کا کام تو برسوں جاری رہے گا۔ اس معاملے میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے اور مجھے امید نہیں کہ ان کے سرمایۂ تحقیق کا محاکمہ کرنے والا کوئی دیدہ ور عالم آسانی سے دستیاب ہو سکے گا۔ اس لیے کہ بقول شاعر:

شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس لیے میں چاہوں گا کہ اس وقت ان کی شخصیت کا ایک ایسا سرسری سا خاکہ پیش کر سکوں جو دکھا سکے کہ ان کے ذوقِ علم کا سفر کن دشوار مرحلوں سے گزرا۔ ان کے جن بیشتر اور معاصر علما نے تحقیق کے میدان میں ان کی رہبری کی ان میں مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی عرشی اور محی الدین قادری زور کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن یہ وہ اکابر شخصیتیں ہیں جو اشرافیہ اور اہلِ علم دوست خانوادوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی تعلیم اعلیٰ تعلیمی اداروں اور بعض کی یورپ کی دانشگاہوں میں ہوئی تھی۔ علمی تحقیق کا کام یکسوئی اور لگن سے کرنے کے لیے انھیں بے شمار سہولتیں اور آسائشیں مہیا تھیں، لیکن رشید صاحب مرحوم کی ذات علمی کام کی سہولتیں تو بڑی بات ہے زندگی کی ادنیٰ سہولتوں سے بھی محروم تھی۔

رشید صاحب میرے ہم وطن تھے۔ اور نو عمری میں یعنی 1949 میں جب میں نے گاندھی فیض عام کالج میں انٹر میں داخلہ لیا تبھی ان سے میرا تعارف ہوا۔ عمر میں وہ مجھ سے کم از کم سات آٹھ سال بڑے تھے (ان کے ریکارڈ میں درج تاریخ ولادت 10 جنوری 1930 صحیح نہیں) ان سے جب میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ محلہ لال املی کے پاس واقع مدرسہ فیض عام میں مدرس تھے۔ شعر و ادب کا اچھا ذوق تھا اور شہر میں ان کے علم کی دھاک تھی۔ انھوں نے شہر کے مشہور مدرسہ بحرالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے والد امیر حسن خاں سپاہی تھے اور بقول رشید حسن خاں انھوں نے ترکِ موالات کی تحریک سے متاثر ہو کر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی عسرت میں زندگی بسر کی۔ ان کے بچے اسکول کی تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے۔ نو عمری میں رشید صاحب برسوں آٹا پیسنے کی چکی پر ملازم رہے۔ شہر میں فوجی لباس تیار کرنے کی ایک آرڈیننس فیکٹری تھی۔ اب بھی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں اس میں سیکڑوں مزدوروں کی نئی بھرتی ہوئی تو رشید صاحب کو بھی عارضی سرکاری نوکری مل گئی۔ یہاں کچھ اشتراکی نظریے کے ٹریڈ یونین لیڈروں سے ان کی دوستی ہوئی اور وہ فیکٹری کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں فعال ہو گئے۔ بائیس دن کی فیکٹری میں ہڑتال ہوئی۔ اس دوران جنگ ختم ہو گئی اور ہزاروں مزدوروں کو بیک جنبشِ قلم نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ رشید صاحب بھی بے روزگار ہو گئے۔

شہر میں شاعروں کی کثرت تھی۔ ان کے الگ الگ اکھاڑے تھے۔ شعرا میں باہمی چشمکیں تھیں۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ رشید صاحب اگر کسی مشاعرے میں پہنچ جاتے تو استاد شاعر بھی ڈر جاتے۔ وہ زبان و بیان کی خامیوں پر برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے تھے۔ فنِ عروض و بیان پر ان کی گہری نظر تھی۔ شعر گوئی میں نے بھی شروع کر دی تھی۔ رشید صاحب نے مجھے ایک استاد شاعر حضرت عابد شاہجہانپوری سے ملوایا اور اصرار کیا کہ اپنا کلام انھیں دکھاؤں۔ میں نے دو غزلیں انھیں بغرضِ اصلاح و مشورہ دیں لیکن ان کی لفظی اصلاح سے اطمینان نہیں ہوا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاہم ان سے اور رشید صاحب سے دوستانہ مراسم قائم رہے۔ رشید صاحب نے اس دوران مولوی وغیرہ کے کچھ اورینٹل امتحانات پاس کیے۔ ان کی بنیاد پر غالباً 1956 کے آس پاس ان کا تقرر فارسی استاد کی حیثیت سے اسلامیہ اسکول میں ہو گیا۔

1957-58 میں جب میں علی گڑھ میں پی۔ ایچ ڈی کر رہا تھا اور جامعہ اردو کا ماہنامہ ''ادیب'' ترتیب دے رہا تھا تو رشید صاحب سے لکھوا کر میں

نے ان کے کئی مضامین ''ادیب'' میں شائع کیے۔ ان میں ایک مضمون 1857 کی بغاوت پر تھا۔ اسی زمانے میں رشید صاحب نے ''اغلاط اللغات'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون انجمن ترقی اردو ہند کے جریدے ''اردو ادب'' میں اشاعت کی غرض سے مجھے بھیجا۔ میں نے مضمون آل احمد سرور صاحب مدیر رسالہ کو اس امید کے ساتھ دیا کہ وہ اسے ضرور شامل کریں گے۔ لیکن چار پانچ مہینے تک پاس رکھ کر مضمون انھوں نے مجھے واپس کر دیا۔ مجھے تکلیف ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ مجھے یقین تھا کہ سرور صاحب نے مضمون پڑھنے کی زحمت نہیں کی کیوں کہ ان کے نام سے بھی وہ آشنا نہیں تھے۔ میں مضمون لے کر اپنے استاد معظم رشید احمد صدیقی کے پاس گیا۔ ان سے التجا کی کہ وہ اسے ضرور پڑھیں اور پسند آئے تو سرور صاحب کو ''اردو ادب'' میں اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ وہ انجمن کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے مضمون پڑھ کر اپنی سفارش کے ساتھ سرور صاحب کو بھجوا دیا۔ اور اس طرح اس طویل تحقیقی مضمون کی پانچ چھ قسطیں ''اردو ادب'' میں شائع ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ رشید صاحب کا یہ پہلا عالمانہ مضمون تھا جس نے اردو کے اہل نظر کو متاثر کیا۔

1959 میں میرا تقرر دہلی یونیورسٹی میں ہو گیا تو صدر شعبہ خواجہ احمد فاروقی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ انھیں شعبے کے تحقیقی پروجیکٹ کے لیے ایک ایسے اسکالر کی ضرورت ہے جو عربی اور فارسی سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ میں نے فوراً رشید صاحب کا نام لیا اور ان کے تبحر علمی کی تعریف کی۔ شاید ''اردو ادب'' میں انھوں نے ان کا مقالہ پڑھا تھا۔ چند منٹ سوچ کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ابھی تار گھر جائیے اور رشید صاحب کو تار دیجیے کہ اگر ڈیڑھ سو ماہانہ (جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی رقم تھی) مشاہرے پر انھیں یونیورسٹی کی یہ ملازمت منظور ہو تو فوراً آ جائیں۔ تار رشید صاحب کو ملا اور وہ دوسرے ہی دن صبح کو دہلی پہنچ کر دریا گنج میں میری قیام گاہ پر آ گئے۔ میں انھیں فاروقی صاحب کے پاس لے کر گیا اور چند روز بعد آ کر انھوں نے ریسرچ اسسٹنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

یہاں سے ایک اسکالر اور عالم کی حیثیت سے رشید صاحب کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ شعبے کے تحقیقی کاموں کے علاوہ وہ تحقیقی مجلّہ ''اردوئے معلّٰی'' کی ترتیب و طباعت کا کام بھی دیکھتے تھے۔ شعبے سے تذکرۂ سرور، گنج خوبی (میر امن) اور دیوان بقا جیسی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی ترتیب میں بلاشبہ رشید صاحب کی محنت کا حصہ بھی رہا ہے۔ شعبے میں خواجہ احمد فاروقی صاحب مرحوم نے انھیں تحقیقی کام کرنے کے لیے جملہ سہولتیں فراہم کر دی تھیں۔ ان سے انھوں نے فائدہ بھی اٹھایا۔ شعبے سے زیادہ وہ اپنے ذاتی علمی کاموں پر توجہ دیتے رہے۔ چھ سال تک میں صدر شعبہ رہا تو میں نے بھی ان کو ذاتی کام کرنے کی پوری آزادی دی۔ ان کا کمرہ کچھ فاصلے پر دوسری عمارت میں تھا۔ اگر ان سے کسی معاملے میں مشورے کی ضرورت درپیش ہوتی تو ہمیشہ ان کو اپنے کمرے میں بلانے کے بجائے میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ بعض رفیقوں کی شکایت کے باوجود میں نے کبھی کسی معاملے میں ان سے محاسبہ نہیں کیا۔

رشید صاحب کی علمیت اپنی جگہ، لیکن ان کی ذات میں ہمیشہ مجھے ایک طرح کی بے چینی، تلخی، بیزاری اور برگشتہ دلی کا شدت سے احساس ہوا۔ ابتدا میں مدت تک وہ منفی نکتہ چینی پر آمادہ رہتے تھے۔ کسی علمی کام یا کسی مشہور ادبی شخصیت کو Demolish کر کے انھیں جو داد ملتی تھی اس سے وہ خوش ہوتے تھے۔ شاید اس معاملے میں ان پر قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کا بھی اثر تھا۔ لیکن قاضی صاحب کی گرفت علمی ہوتی تھی۔ رشید صاحب کی تحریروں میں بت شکنی کا جذبہ کچھ تلخی پیدا کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے کئی بار ان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ وہ پٹھان تھے۔ کبھی کبھی انتقامی جذبہ بھی ان پر حاوی ہو جاتا تھا۔ مثلاً آل احمد سرور صاحب سے انھیں کچھ شکایات تھیں۔ نتیجے میں ان کی نگرانی میں ترتیب پانے والی، علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی ابتدائی جلدیں جب شائع ہوئیں تو انھوں نے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ بے شک تحقیق کی جن چھوٹی بڑی غلطیوں کی انھوں نے گرفت کی وہ صحیح تھی لیکن یہی کام اگر وہ ہمدردانہ اور تعمیری جذبے سے انجام دیتے تو وہ انداز زیادہ علمی ہوتا۔ اسی طرح خواجہ احمد فاروقی صاحب ان کے عہدے میں اضافہ اور ترقی کے معاملے میں ان کے مطالبات پورے نہیں کر سکے۔ اس کا بڑا سبب ان کی رسمی تعلیمی اسناد کی کمی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''تذکرۂ سرور'' جو فاروقی صاحب کے نام سے شائع ہوا اور جس کی ترتیب میں علمی معاون کی حیثیت سے رشید صاحب نے بڑی مدد کی اس میں کچھ ایسے کھانچے چھوڑ دیے گئے یا رہ گئے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے سختی کے ساتھ ان کی گرفت اور نکتہ چینی کی، اور شعبے کے لوگوں کو کہنا پڑا کہ رشید صاحب نے اپنے منصبی فرائض ادا کرنے میں کوتاہی برتی۔ دراصل رشید صاحب کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ اسکول اور یونیورسٹی نیز انگریزی زبان کی تعلیم سے محرومی نے انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور اگرچہ اکیڈمیوں اور اعلیٰ علمی اداروں نے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازنے میں کوتاہی نہیں کی لیکن اس احساس کی گرانی سے وہ نجات نہ پا سکے۔ بہر حال یہ ایسے مسئلے ہیں جن پر گفتگو ہوتی رہے گی۔ دہلی میں ان کے قیام کے آخری زمانے میں ان کے اندر کی تلخی اور تناؤ میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے اعلیٰ معیار کے کچھ مثبت تحقیقی اور علمی کام انجام دیے۔ کئی کلاسیکی کتابوں کے متن مثالی صحت اور تنقیدی تعارف کے ساتھ شائع کیے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھیں کچھ ایسے خوش ذوق شعرا اور شاعرات کی صحبتیں میسر آ گئی تھیں جن کے ساتھ وہ گل رنگ شامیں گزارتے اور خوش رہتے تھے۔ اس سچائی سے انکار بھی مشکل ہے کہ ایسا علمی تبحر رکھنے والے اور صرف اپنی لگن، جانفشانی اور علمی انہماک سے شہرت اور ناموری کی ایسی ارفع منزلوں تک پہنچنے والے اسکالر اردو میں اب مشکل ہی سے پیدا ہو سکیں گے۔

---

(1) رشید صاحب کے خاص مقرب اختر شاہجہانپوری نے فون پر اطلاع دی۔

□□□

صدیق الرحمٰن قدوائی

یہ جو اپنے خاں صاحب ہیں نا!

شاید سنہ پچپن چھپن کی بات ہے کہ قومی آواز میں فیض احمد فیض پر ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی شاعری پر بہت سارے اعتراضات تھے، مثلاً فیض کی ایک مشہور نظم کے دو مصرعے ہیں:

کیسے سفاک حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

اعتراض یہ تھا کہ برفاب تو خود برف کا پانی ہے، وہ کیسے پگھلے گا۔ یہاں برف ہونا چاہیے تھا۔ معترض کی بات تو صحیح تھی مگر میں نے سوچا کہ یہ کون شخص ہوسکتا ہے جس کا تصور گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھلنے والے حسیناؤں کے جسم کو چھوڑ کر برف اور برفاب کی لغت میں منجمد ہو جائے۔ مصنف کا نام دیکھا تو رشید حسن خاں لکھا تھا۔ کچھ عرصے بعد شعری زبان کے سلسلے میں اور بحثیں بھی شائع ہوئیں۔ اختر تلہری اور اثر لکھنوی کے ساتھ رشید حسن خاں اکثر گتھے ہوئے پائے جاتے تھے۔ ان تحریروں کو دیکھ کر مجھے ایک دن اچانک بڑا اطمینان ہوا۔ سوچا کہ یہ شخص جس کا نام رشید حسن خاں ہے اپنے اطوار سے اختر تلہری اور اثر لکھنوی سے دس بیس سال بڑا ہی ہوگا۔ چنانچہ جلد مر جائے گا اور فیض کی شاعری کی حسیناؤں کے جسم کی حرارت برف و برفاب کی گردان سے بالآخر محفوظ ہو جائے گی پھر وقت گزرتا گیا۔ میں علی گڑھ سے دہلی آیا اور خواجہ احمد فاروقی صاحب کی عنایت سے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوا۔ فاروقی صاحب بے حد فعال، سلیقہ مند، سخت ڈسپلن کے عادی ہونے کے باوجود بڑے خوش مزاج، خوش گفتار اور بُردبار انسان تھے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو نہ صرف قائم کیا بلکہ اس بلندی تک پہنچایا کہ برعظیم کے دوسرے ادارے رشک کرنے لگے۔ یہاں فاروقی صاحب نے اطراف و جوانب سے جمع تو بھانت بھانت کے لوگوں کو کیا مگر سب کو بامقصد کاموں میں لگا دیا اور اردو تحقیق کا رخ ایسے موضوعات کی طرف موڑا جدھر پہلے کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ یہ زمانہ قاضی عبدالودود صاحب کے تحقیقی تبصروں کی مقبولیت کا تھا۔ خود فاروقی صاحب کی میر تقی میر والی کتاب پر وہ پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ انھوں نے ساری اردو دنیا کو دہلا رکھا تھا۔ ہمارا معمولی طالب علم بھی اب بے چارہ علیٰ ہٰذالقیاس جیسا روزمرّہ استعمال کرنے لگا تھا۔ یونیورسٹی کے اچھے بھلے لوگوں کے دماغوں میں دیکھتے دیکھتے اچانک تحقیق کی رگ پھڑک اٹھتی تھی اور پھر کوئی بھی نارمل نہیں رہ جاتا تھا۔ میں علی گڑھ کا فارغ رشید صاحب اور سرور صاحب، خورشید الاسلام صاحب مسعود صاحب، جذبی صاحب، خلیل الرحمن اعظمی صاحب جیسے لوگوں کی آنکھیں دیکھے ہوا ہشاش بشاش نوجوان ایسے لمحوں میں ششدر رہ جاتا۔ صبح و شام کی خوش باشیوں میں شامل رہنے والے ان ہی ساتھیوں میں کوئی حواشی و تعلیقات کے گورکھ دھندے میں پھنسا ملتا تھا تو کوئی کسی قدیم مخطوطے کے اول و آخر کے مفقود الخبر ہونے پر سر پیٹتا تھا اور کوئی کسی کرم خوردہ نسخے کے صفحات کے اندر جھانک جھانک کر آنکھیں دیئے دے رہا تھا۔ اکثر تو ان کی بھاشا سن کر ہی میری طبیعت مکدر ہو جاتی تھی۔ فاروقی صاحب کی شہہ پر میں نے بھی ان سب کو منہ چڑھانے کے لیے پہلے ماسٹر رام چندر اور پھر گل کرسٹ پر زور آزمائی کر ڈالی۔ ان دنوں فاروقی صاحب کے دولت کدے پر اکثر محفلیں ہوتی تھیں اور کام کے وقت کام بھی بڑی سنجیدگی سے ہوتا۔ دراصل وہاں کام کا وقت تو چوبیس گھنٹے رہتا تھا۔ ایک دن فاروقی صاحب کے ہاں ایک صاحب ایک کرسی پر الگ تھلگ لیے دیے سے بیٹھے ہوئے اپنا کام کر رہے تھے۔ چہرے مہرے سے کچھ غلط آدمی نہیں لگتے تھے۔ دستور کے مطابق نہایت سلیقے سے چائے آئی اور یہ صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آئے۔ تعارف ہوا۔ نام رشید حسن خاں بتایا گیا۔ اب یہ روز دکھائی دینے لگے۔ بات آگے بڑھتی گئی اور ہم لوگ کافی ہاؤس میں پابندی سے ملنے لگے۔ مجھے لگا کہ یہ جو بھی شخص ہو، اچھا اور درست آدمی ہے۔ اسی دوران یہ کھلا کہ یہ وہی برف و برفاب والے رشید حسن خاں ہیں اور اب تک مرکھپ نہیں سکے۔ بس اپنی تحریروں سے اپنی عمر کے بارے میں دھوکا دے کر دشمنوں کی امیدیں بڑھاتے رہے، مگر ان سے اب کچھ ایسا تعلق ہوا کہ ان کی موت کی خواہش درازیٔ عمر کی دعاؤں میں تبدیل ہوگئی۔ اب جب تیس پینتیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور بیتے ہوئے دنوں کی کمائی پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ انمول خزانے بھی ہم نے جمع کیے ہیں ان میں ایک رشید حسن خاں کی دوستی بھی ہے۔

خاں صاحب شاہ جہاں پور کے ہیں اور پٹھانوں کے کسی بڑے اڑیل جرگے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ دوستوں کی دوستی میں وہ کس حد تک جا سکتے ہیں اس کا اندازہ مجھ جیسے دوستوں کو ہے اور دشمنوں سے دشمنی کا اندازہ تو شاید اردو دنیا میں سب ہی کو ہوگا۔ دشمن بنانے کا گر ہمارے زمانے میں ان سے بہتر کسی کو نہیں آتا۔ ان کا قلم بس خون کا پیاسا رہتا ہے۔ اگر روشنائی لال ہو کر نہ نکلے تو وہ خاں صاحب کا قلم نہیں۔ ایک بار اپنے دفتر میں خالی ہاتھ بیٹھے تھے، برابر میں دہلی کے مشہور خوش نویس زیدی صاحب کسی مسودے کی کتابت کر رہے تھے اور خاں صاحب اچھے بھلے حروف کے خم و پیچ میں مین میخ نکالنا شروع کرنے والے ہی تھے کہ میں پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ دفتر آتے ہوئے راستے میں کسی نے ان کا قلم اڑا لیا۔ میں نے سنا تو اردو ادب پر اس چور کے احسان پر

اظہار تشکر کیا۔ خاں صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے اور پھر کافی کی پیالی پر معاملہ رفع دفع ہوا۔ خاں صاحب کے اور میرے مزاج میں کوئی بات بھی مشترک نہیں۔ مگر قدرت نے ہم دونوں میں نہ جانے ایسی کون سی شے رکھ دی ہے کہ آج تک کبھی لڑے نہیں۔ مدتوں بعد جب بھی ملتے ہیں تو بات وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں چھوٹی تھی۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ سب جانتے ہیں اور آئندہ اس کی اہمیت کا اور زیادہ اندازہ ہوگا۔ میرے سامنے انھوں نے جب بھی تحقیق کا موضوع چھیڑا، میں نے اسے ٹال کر ادھر ادھر کی باتوں میں انھیں لگالیا اور جب ہم دونوں ساتھ ہوں تو دراصل ادھر ادھر کی باتوں میں جی بھی خوب لگتا ہے اور خاں صاحب پیشۂ تحقیق کے باہر ڈھنگ کے لوگوں کی بستی کے آدمی لگنے لگتے ہیں۔ ایک بار طے ہوا کہ کبھی کبھی ہم دونوں اس طرح ملیں کہ کسی تیسرے کا قدم درمیان میں نہ ہو۔ یہ زمانہ وہ تھا جب وہ جوبلی ہال کے کھانے کے انچارج تھے۔ وہ بہترین کھانے بلکہ ایسی نعمتیں پکواتے تھے کہ ہوسٹل والوں نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔ لازم تھا کہ ان کے اس انتظام کا جائزہ لینے کے لیے ان کے دوست بھی وقتاً فوقتاً پہنچتے رہیں۔ چنانچہ ہماری یہ ملاقاتیں بڑی کامیاب رہیں۔ بس دو بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی ہم لوگ بیٹھے کسی نہ کسی بڑے قومی سانحے کی خبر آگئی۔ ہم نے طے کیا کہ ہمارا اس طرح ملنا قومی مفاد میں نہیں ہے چنانچہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ان کے ہوسٹل میں بند ہوا۔

خاں صاحب نے مجھ پر ناراض نہ ہونا کیسے سیکھا یہ تو مجھے نہیں معلوم اور یقیناً انھیں بھی نہیں معلوم ہوگا کہ بعض اوقات تعلقات کی نوعیت خود ہی ہر بات کو اس طرح طے کر دیتی ہے کہ اس پر کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ مگر انھیں ناراضگی کا سامان بہم پہنچانے میں میں نے بعض اوقات خاصا اہتمام کیا۔ میں جب بھی ملک سے باہر گیا علم و تحقیق کا حیلہ کر کے گیا۔ یہاں دوستوں سے اور کیا کہہ کے جاتا۔ خاں صاحب کی فرمائش ہوتی کہ لندن، پیرس وغیرہ میں زندگی کے یہ عزیز ترین لمحے فلاں کتاب کے فلاں ایڈیشن کے فلاں صفحے کی فلاں سطر کے فلاں لفظ کے اعراب گننے میں ضائع کروں، گویا میں بھی سفاک حسیناؤں کی جگہ برف و برفاب کے چکر میں کھو جاؤں۔ پٹھان کتنا ہی پڑھ لکھ جائے، مہذب ہو جائے، چالاک بننے کی کوشش کرے مگر اس کی سادہ لوحی نہیں جاسکتی چنانچہ وہ اس کی توقع بھی کرتے رہے کہ میں نے ان کی بات پر کان دھرا ہوگا۔ لوگ مغربی دنیا میں کیا کیا ارمان لے کر جاتے ہیں۔ وہاں کی ہوا کھانے والوں کو تو جانے دیجیے جن لوگوں نے یہاں رہ کر صرف وہاں کے خواب دیکھے ہیں ذرا ان کے دل سے پوچھیے۔ مگر خیر! خاں صاحب مجھے اتنے عزیز ہیں کہ جہاں بھی رہا انھیں یاد کرتا رہا کتب خانوں کے باہر کی دنیا میں بھی وہ نہ جانے کتنے موقعوں پر یاد آئے۔ ان کی فرمائش کو بھی میں بھولا نہیں۔ جب لندن سے پیرس سدھارنے کا وقت آیا تو لندن میں میرے ایک ہم دم و ہم راز بلکہ شکیب خاطر اہلِ وفا ہیں جنھیں اہل دنیا ضیاء الدین شکیب کہتے ہیں اور میرے زمانۂ طالب علمی کے دوست اور دیار غیر میں میرے اکیلے سرپرست ہیں۔ تحقیق کے سمندر میں گلے گلے ڈوبے ہوئے لندن کے کتب خانوں کی الماریوں اندر تک اترتے ہوئے ان سے خاں صاحب کی فرمائش کا ذکر کیا تو انھوں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ ذمے داری قبول کی کہ میرے جانے کے بعد وہ خاں صاحب کو ان کے مطلوبہ مسودات کی نقل بھیج دیں گے مجھے اطمینان ہوا کہ خاں صاحب کو خوش کرنے کا بہانہ مل گیا۔ مگر جس طرح میں اپنے شکیب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسی طرح خاں صاحب مجھے جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم سب دوست مطمئن رہے مگر پٹھان دوست ہی کیوں نہ ہو، حساب تو ہمیشہ بے باق رکھتا ہے۔ اُدھار کبھی نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ ''باغ و بہار'' کے مقدمے میں دو چار فقرے لگا ہی گئے۔ یہ بھی محض ان کی شرافت اور ہماری بے لاگ دوستی کی دلیل ہے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک خاں صاحب اس کی ساری علمی و ادبی فتوحات کو مٹی میں ملا چکے ہوتے۔

خاں صاحب دراصل مخصوص صحبتوں کے آدمی ہیں، مجمعے جم گھٹے کے نہیں۔ حالاں کہ مجمع انھیں مل جائے جو اکثر سیمیناروں یا جلسوں میں مل بھی جاتا ہے تو انھیں بہت برا بھی نہیں لگتا کہ وہ ایسے موقعوں سے لوگوں کو ڈرانے بڑکانے کا کام لیتے ہیں اور خصوصاً نوجوان جو ان سے پہلے پہل ملے ہوں یا کم ملے ہوں بالکل ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں مگر خاں صاحب اتنے بھیانک ہیں نہیں جتنے وہ خود لگنا چاہتے ہیں۔ میری طرح وہ بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ رکھنا تو پسند نہیں کرتے پھر بھی ان کے دوستوں کا حلقہ اچھا ہے اور اپنی صحبتوں کے اعتبار سے معتبر لگتے ہیں اور ہم لوگوں کے ساتھ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے خاص طور سے اپنے بزرگ غلام ربانی تاباں صاحب بہت یاد آتے ہیں کہ مخصوص ترین صحبتیں وہی تھیں جہاں تاباں صاحب بھی ہوتے تھے۔ پٹھانوں میں ایک قبیلہ ایسا ہے جس نے اپنے نام کے ساتھ پٹھان ہونے کی علامت کو باقی نہیں رہنے دیا۔ شاید اس لیے کہ سماج نے ان کی ہر ادا سے خود بخود پہچان لیا کہ وہ نہ صرف پٹھان ہیں بلکہ بالکل اصل۔ پھر اگر وہ محقق اور نقاد نہ ہوں تو انھیں لوگوں کو ڈرانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاباں صاحب ایسے ہی پٹھانوں میں تھے، بڑے نوک پلک کے شاعر، شفیق بزرگ، بے حد روادار اور صبر و ضبط کے عادی۔ ان کی زیادہ تر خصوصیات شاید بائیں بازو کی تحریکات کے ڈسپلن میں ایک عمر گزارنے کی بدولت ان میں آئی تھیں۔ خاں صاحب ٹھہرے گھور محقق اور ترقی پسندی کے گھنگھور دشمن۔ وہ بے تکلف صحبتیں پُر لطف چشمکوں سے بڑی خوشگوار اور جاندار ہو جاتیں۔ اور لاکھ کوشش کے باوجود دو پٹھانوں کا متحدہ محاذ نہ بن پاتا کہ دوسرے اہلِ بزم ان کی زد پر آسکتے۔

خاں صاحب کے بارے میں میرے کہنے اور نہ کہنے کے لائق ابھی ہزاروں باتیں ہیں جنھیں ان سے زیادہ کون جانتا ہے مگر بہرحال ہیں تو وہ اپنے آدمی، اس لیے فی الحال یہیں پر بس کرنا مناسب ہے۔

□□□

مخمور سعیدی

رشید حسن خاں

''باتیں ہماری یادرہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا''

رشید حسن خاں اردو زبان و ادب کے ایک معتبر محقق، باذوق نقاد اور سلیقہ مند مدوّن تھے، یہ ان سے منسوب ایسی صفات ہیں، جنھیں ان کے مخالفین بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ علمی امور میں اختلاف معیوب نہیں بلکہ اس سے دید و دریافت کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں جو ایک امرِ مستحسن ہے لیکن خاں صاحب سے اختلاف کی جسارت کم لوگوں کو ہوئی، بعض حلقوں کی طرف سے ان کی اور ان کے کاموں کی مخالفت زیادہ کی گئی۔

اختلاف اور مخالفت میں جو فرق ہے، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ رشید حسن خاں سے زیادہ اختلافات اس لیے نہ کیے جاسکے کہ ان کے نتائجِ تحقیق اور ان کی تنقیدی رائیں ایسی صحیح سمتوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں جنھیں رد کردینا آسان نہیں اور انھوں نے تدوین کے بھی جو نمونے پیش کیے، مثالی کہے جاسکتے ہیں لیکن ان کی مخالفت بہت ہوئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

دراصل رشید حسن خاں علم و فضل کی دشوار گذار منزلوں کو سر کرتے ہوئے اس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھے اس کا حوصلہ ان کے بہت سے معاصرین نہ کرسکے۔ ان کے معاصرین نے علمی فتوحات سے زیادہ مادّی فتوحات پر نظر رکھی اور اس میدان میں وہ خاں صاحب سے بہت آگے نکل گئے۔ خاں صاحب ان کی اس پیش قدمی سے ذرا کبیدہ خاطر نہ ہوئے کہ ان کا مقصودِ سفر ہی کچھ اور تھا۔ ان کی پیش قدمی کا رخ ایک مختلف سمت میں رہا اور یہاں وہ ان لوگوں کو، جو خدمتِ علم و ادب کی آڑ میں ذاتی امنگوں کی تکمیل کے درپے تھے، پیچھے چھوڑ گئے۔

کہا گیا کہ رشید حسن خاں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ تنک چڑھے اور گھمنڈی ہیں اور اپنے اس گھمنڈ میں دوسروں کی دل آزاری تک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ان کی خود بینی اور خود پسندی نے انھیں مردم بیزار بنا دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور ایسی دوسری تمام باتیں جو خاں صاحب کے بارے میں بعض لوگ کہتے رہے ہیں، ان کا تعلق خاں صاحب کی علمی شخصیت سے نہیں، نجی شخصیت سے ہے، اس لیے اگر انھیں درست بھی مان لیا جائے تو خاں صاحب کی عادات و اخلاق کے بارے میں کچھ منفی خیالات بعض لوگوں کے ذہن میں جگہ بنا سکتے ہیں لیکن ان کے علمی اکتسابات اور کمالات پر ایسی باتیں کیا اثر ڈال سکتی ہیں! ویسے واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری باتیں، ان بے بنیاد افواہوں کی طرح ہیں جو بدنیتی سے دیدہ و دانستہ پھیلائی جاتی ہیں اور یہ صرف انھی لوگوں کو مغالطے میں ڈال سکتی تھیں، جو خاں صاحب کو ذاتی طور پر نہیں صرف ان کی تحریروں کے حوالے سے انھیں پہچانتے تھے۔ اپنی تحریروں میں بلا شبہہ وہ آدابِ مروّت و محبت کے قائل نظر نہیں آتے کہ اپنے قلم سے انھوں نے حقیقتوں کی تلاش اور صداقتوں کی ترجمانی کا کام لیا ہے اور اپنی علمی زندگی کے آغاز ہی سے ان کا یہ شعار رہا۔

مصدر علم و فضل ذات تری
تجھ سے مشتق ہیں سب صفات تری

درسِ فن تجھ سے گفتگو کرنا
ادب آموز بات بات تری

ہیں طلوعِ شعور دن تیرے
آگہی کا فروغ رات تری

سب سے ممتاز ہمسروں میں تو
مختلف سب سے کائنات تری

رشید حسن خاں سے میرا غائبانہ تعارف لگ بھگ چالیس سال پہلے ہوا۔ ان دنوں میں گوپال مِتّل صاحب کے رسالے ''تحریک'' میں کام کرتا تھا۔ رسالے کی ڈاک میں ہی دیکھتا تھا۔ ایک دن شاہجہانپور سے ایک بھاری بھرکم لفافہ موصول ہوا۔ کھولا تو اس میں ایک مختصر سا خط اور ایک مفصّل مضمون تھا فیضؔ کی شاعری پر۔ خط میں لکھا تھا کہ فیضؔ ہمارے دور کے بہت مقبول شاعر ہیں لیکن اس مقبولیت کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ ان کی شاعری میں زبان اور بیان کے جو نقائص پائے جاتے ہیں وہ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں، اس سے فیضؔ کے بعد آنے والے شاعر اس غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں کہ ان نقائص کا شاعری کی اچھائی یا برائی سے قریب و دور کا کوئی واسطہ نہیں۔ مضمون میں فیضؔ کے اس وقت تک کے شائع شدہ مجموعوں کو سامنے رکھ کر نہ صرف زبان و بیان کی بہت سی خرابیوں کی بلکہ فکر و احساس کی بے راہ رویوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ مضمون ''تحریک'' میں شائع ہوا تو اس کی بازگشت دور دور تک سنائی دی۔ فیضؔ کے ساتھ غیر مشروط عقیدت رکھنے والوں نے اس کا برا مانا لیکن شاعری کے ان قدر شناسوں نے جو فیضؔ کی ذات یا ان کے شعری نظریات سے اس طرح کی کوئی جذباتی یا ذہنی وابستگی نہیں رکھتے تھے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس مضمون کی اثر آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد جن لوگوں نے فیضؔ کی شاعری پر قلم اٹھایا، ان میں سے اکثر نے اس کا حوالہ ضرور دیا۔

غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہمارے دور میں جو لوگ معتبر سمجھے گئے، ان میں ایک نام مجروح سلطانپوری کا ہے۔ ان کا یہ اعتبار و امتیاز آج بھی برقرار ہے لیکن ترقی پسندوں کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد انھوں نے نظریاتی شدت

پسندی کے زیر اثر بعض ایسی غزلیں بھی کہیں جو ہنگامی سیاست کے تقاضوں کی تابع مہمل تھیں۔ یہ اندازِ سخن غزل کی اس روایت کی نفی تھا جس کی توسیع ہمیں خود مجروح صاحب کی اچھی غزلوں میں نظر آتی ہے اور جس کا زور ہمیشہ اس پر رہا ہے کہ ماورائے سخن بھی ہے اک بات۔ خاں صاحب کا دوسرا مضمون جو ''تحریک'' نے شائع کیا، مجروح کی غزل گوئی پر تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ترقی پسندی کے بے جا جوش میں ایک اچھے غزل گو شاعر کے برباد ہو جانے کے کیسے قوی امکانات ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مجروح صاحب نے جلد ہی اس روش کو خیر باد کہہ دیا اور صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئے۔

رشید حسن خاں کا ایک اور ہنگامہ خیز مضمون جو ''تحریک'' میں شائع ہوا ''علی گڑھ تاریخِ ادب اردو'' پر تھا جو لاکھوں روپئے کے مصارف سے مشہور و معتبر لوگوں کی نگرانی میں تیار کرائی گئی تھی لیکن جو غلط بیانیوں کا پشتارہ تھی۔ خاں صاحب نے کتاب کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مرتبین کے تسامحات کی بھی نشاندہی کی تھی اور ایسے بیانات کی بھی جو حقائق کے بجائے مرتبین کے ذہنی تحفظات بلکہ تعصبات کو سامنے لاتے تھے۔ تسامحات کا امکان تو ہر ایک کے ساتھ ہے لیکن اپنے مفروضات کو تاریخی حقیقتیں بنا کر پیش کرنے کی کوشش ایک مجرمانہ فعل تھا جس کی خاں صاحب نے بہت سخت گرفت کی۔ ایسی غیر ذمے دارانہ کتاب کی اشاعت کسی نجی ادارے کی طرف سے بھی قابلِ گرفت سمجھی جاتی لیکن یہ کتاب تو ایک قومی ادارے نے قومی حکومت کی فراہم کردہ مالی مدد سے تیار اور طبع کرائی تھی اس لیے جب اس کی گمراہ کن نوعیت سامنے آئی تو بڑا ہنگامہ ہوا اور بالآخر یہ کتاب واپس لے لی گئی۔

خاں صاحب نے اردو املا کے مسئلے پر بھی توجہ صرف کی اور اس کی معیار بندی پر متواتر زور دیتے رہے، ان کی کتابیں ''اردو املا'' جو بڑوں کے لیے ہے اور ''اردو کیسے لکھیں'' جو بچوں کے لیے ہے، اسی سلسلے کی کوششیں ہیں۔ خاں صاحب سے پہلے مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے بزرگ بھی اس مسئلے پر دماغ سوزی کر چکے تھے لیکن یہ خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن اس معاملے پر اپنی معروضات میں نے ''اردو املا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پیش کی تھیں۔ یہ تبصرہ ''تحریک'' میں شائع ہوا تھا۔

رشید حسن خاں کا ایک بڑا کام اہم کلاسکی متون کی تصحیح و تدوین اور ان کی پیشکش ہے۔ یہ کام تحقیقی ذوق کے علاوہ تنقیدی شعور کا بھی تقاضا کرتا ہے اور قدرت نے یہ دونوں صفات خاں صاحب کو ودیعت کی تھیں۔ اس سلسلے کی کئی کتابیں مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہیں جو اکثر اہلِ ذوق کی نظر سے گزری ہوں گی، ان میں ایک کتاب ''انتخابِ کلامِ ناسخ'' ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ناسخ کے کلام کا اس سے بہتر انتخاب میرے محدود مطالعے میں ابھی تک نہیں آیا، اس کا مقدمہ خاں صاحب کی ادبی سوجھ بوجھ ہی کو نہیں، تاریخی عوامل اور امور سیاست سے بھی ان کی باخبری کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ میں تہذیبی و ادبی سطح پر دہلی سے جو انحرافات روبہ عمل آئے، دراصل ان کی نوعیت سیاسی تھی۔ اودھ میں تاریخ نے ایک نئی بساطِ سیاست بچھادی تھی۔ اس بساط پر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس کی کامیابی کی شرط تھی دہلی سے ہر معاملے میں انقطاع و انحراف اور نئے کھلاڑیوں کی اپنی امتیازی پہچان اور انفرادی شان۔ ناسخ کی شاعری کو اس عملِ انحراف کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے اور اس وقت کے لکھنوی معاشرے میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی یہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

تدوین کے سلسلے میں خاں صاحب نے کئی ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے میر امّن کی ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عجائب'' کے ان کے مرتب کردہ نسخے اس کی روشن مثالیں ہیں جن پر ان کے طویل مقدمات میں ان اہم کلاسکی متون سے متعلق تمام مباحث سمٹ آئے ہیں اور بہت سے نکات روشن ہوئے ہیں۔ ان کے مستند متنوں کی تعیین اور ان کی فرہنگوں کی تیاری میں خاں صاحب نے جو محنت اور دیدہ ریزی کی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس طرح کے مشکل کاموں کو کبھی ہاتھ لگایا ہو۔ ان کے علاوہ مثنوی ''سحر البیان'' مثنوی ''گلزارِ نسیم'' ''مثنویاتِ شوق لکھنوی'' ''غرائب اللغات'' اور ''زٹلی نامہ'' (کلیات جعفر زٹلی) کی تدوین بھی انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے کی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے، خاں صاحب سے میرا غائبانہ تعارف، ان کے قیام شاہجہانپور کے زمانے میں ہوا تھا جو ان کا آبائی شہر ہے اور ان سے پہلی ملاقات ''تحریک'' کے دفتر میں ہوئی۔

''تحریک'' کا عملہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ رسالے کے مالک و مدیر گوپال متل، ان کے بڑے بیٹے پریم گوپال اور یہ خاکسار۔ ایک دن سہ پہر کے وقت میں اور پریم گوپال، دفتر کے فرش پر بیٹھے مکتبۂ تحریک کی مطبوعات کے بنڈل بنا رہے تھے جنھیں کہیں باہر بھیجا جانا تھا۔ گوپال متل دفتر میں موجود نہیں تھے، اچانک ایک صاحب جو کرتے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس تھے اور سر پر ٹوپی بھی تھی، تبسم زیر لب کے ساتھ وارد ہوئے اور کہا ''میں رشید حسن خاں ہوں'' میں نے اور پریم گوپال نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور اپنا اپنا نام بتایا۔ خاں صاحب نے تپاک سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی متل صاحب کے بارے میں پوچھا۔ دیر تک بیٹھے رہے اور بتایا کہ اب وہ مستقلاً دہلی آ گئے ہیں۔ خاں صاحب سے مل کر خوشی ہوئی مگر وہ تصویر چکنا چور ہو گئی جو ان کی تحریروں نے ذہن پر نقش کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی ساٹھ ستر سالہ بزرگ ہوں گے۔ خاں صاحب کی عمر اس وقت چالیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔

خاں صاحب پر مردم بیزاری کا الزام تو سراسر بیجا ہے لیکن وہ دیر آشنا اور کم آمیز ضرور تھے۔ دہلی میں ان کے جن لوگوں سے مراسم قائم ہوئے ان میں میرے استاد مرحوم بسمل سعیدی، گوپال متل، غلام ربانی تاباں، شہباز حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور بیگم ممتاز مرزا اور نوجوانوں میں ڈاکٹر اطہر فاروقی کو شاید ان سے زیادہ قربت

رہی۔ اس فہرست کے آخر میں اس خاکسار کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے۔

میرا دوسرا مجموعۂ کلام ’’سیہ بر سفید‘‘ شائع ہوا تو رشید حسن خاں دلّی آ چکے تھے۔ برادرم ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے گھر پر اس کتاب کے اجرا کی تقریب رکھی۔ اس تقریب میں خاں صاحب نے میری شاعری پر ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا ’’ذہن کا سفر‘‘۔ مضمون میں انھوں نے چھوٹے شہر سے نکل کر بڑے شہر میں آ بسنے والے تنہا فرد کے جذبات و احساسات کی نشاندہی میرے کلام میں کی تھی اور اس پر زور دیا تھا کہ دراصل یہ محض نقلِ مکانی نہیں، یہ گزرے ہوئے کل کو خیر باد کہہ کر آنے والے کل کی طرف پیش قدمی کا مرحلہ ہے جس سے بہ سلامت گزر سکنا زیادہ آسان نہیں ہوا کرتا کہ اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ میں ان مقامات سے سلامت روی کے ساتھ گزرا ہوں۔ یہ مضمون نہ صرف یہ کہ اس محفل میں بہت پسند کیا گیا بلکہ جب ایک رسالے میں چھپا تو وہاں سے کئی جگہ نقل ہوا اور اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے ’’مخمور سعیدی۔ ایک طالعہ‘‘ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو اس میں بھی انھوں نے اس مضمون کو شامل کیا لیکن مجھے افسوس ہے کہ خود خاں صاحب کے کسی مجموعۂ مضامین میں یہ جگہ نہ پا سکا۔ انھوں نے غلام ربانی تاباں کی شاعری پر بھی ایک مضمون لکھا تھا، وہ بھی ان کے کسی مجموعۂ مضامین میں شامل نہیں ہے۔

دلّی کی زندگی بڑی جاں کاہ مصروفیتوں کی زندگی ہے، دوستوں سے، بلکہ خود اپنے سے بھی ملاقات کے مواقع کم کم ہی میسر آتے ہیں، مکانی فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں۔ مہینوں گزر جاتے خاں صاحب سے ملنا نہ ہوتا لیکن اس سے تعلق کی وہ گرم جوشی ذرا متاثر نہ ہوتی جو ایک دوسرے کے لیے ہمارے اندر موجود تھی۔ جب بھی ملنا ہوتا خاں صاحب تپاک سے ملتے اور کبھی کبھی اپنے ف آمیز خطوں سے نصف ملاقات کی مسرّت بھی وہ بخشتے رہتے، خاص طور پر اگر میری کوئی شائع شدہ یا نشر شدہ نظم و غزل انھیں پسند آ جاتی تو وہ ضرور خط لکھ کر اس کی داد دیتے اور اس داد میں اپنی پسندیدگی کی وجوہ پر اس طرح روشنی ڈالتے کہ سامنے ہوں تو ان کے ہاتھ چوم لیے جائیں۔

چند برس پہلے تک دلی میں ایسی کئی ذی علم شخصیتیں موجود تھیں کہ کسی علمی ادبی مسئلے میں الجھن پیش آنے پر ان سے رجوع کیا جا سکتا تھا۔ اب ایسے لوگ کم ہی رہ گئے ہیں، ایسے موقعوں پر مجھ حقیر فقیر کا دھیان سب سے پہلے رشید حسن خاں کی طرف ہی جاتا۔ دلّی آنے کے کچھ ہی مدّت بعد کسی وجہ سے خاں صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ واپس شاہجہانپور چلے جائیں۔ ان کے اس فیصلے کی اطلاع جب ان کے کچھ قریبی دوستوں کو ملی، جن کے نام اوپر آ چکے ہیں تو انھوں نے خاں صاحب کے لیے ایک الوداعی محفل کا اہتمام کیا۔ س محفل میں میں نے ایک مختصر نظم پڑھی تھی جس میں خاں صاحب کے ساتھ اپنے تعلقِ قلبی کے اظہار کے علاوہ ان کے اس حسنِ سلوک اور اس فراخدلانہ تعاون کا بھی ذکر تھا جو تشنگانِ علم کو ان سے ملتا رہا تھا۔ بعد میں خاں صاحب نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور ملازمت سے سبکدوشی تک دلّی ہی میں رہے۔

خاں صاحب کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ شعر کے فنی محاسن یا معائب کی بحث ہو، کوئی عروضی مسئلہ ہو، زبان و بیان کی خوبیوں یا خامیوں کا معاملہ ہو، صحت یا عدم صحتِ متن کا سوال ہو، لغات، محاوروں، کہاوتوں اور روزمرّہ کی بات ہو؛ خاں صاحب ہر سوال کا جواب اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ دیتے کہ محسوس ہوتا سامنے کوئی دبستاں کھل گیا ہے۔ اتنا بھرپور علم اوّل تو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور جنھیں نصیب ہو جاتا ہے وہ اس کے صرف میں اکثر بخل سے کام لیتے ہیں۔

ایک اور معاملے میں میں نے اکثر لوگوں کو، بالخصوص ان لوگوں کو جن کی کارکردگی کسی خاص شعبے میں تسلیم کی جا چکی ہو، بخیل پایا ہے، وہ ہے دوسروں کے اچھے کاموں کا اعتراف۔ خاں صاحب اس معاملے میں فراخدل تھے۔ غالب صدی تقریبات کے موقع پر دہلی کے دو رسائل ’’اردوے معلّی‘‘ اور ’’تحریک‘‘ نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں غالب کی فارسی کتاب ’’دستنبو‘‘ کے اردو تراجم شائع کیے، ’’اردوے معلّی‘‘ میں جو ترجمہ شائع ہوا وہ خاں صاحب کے نام سے نہیں تھا لیکن کیا ہوا انھی کا تھا۔ ’’تحریک‘‘ میں جو ترجمہ چھپا وہ میں نے کیا تھا۔ دونوں رسالے ساتھ ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ خاں صاحب نے میرا ترجمہ پڑھا تو اس کی داد ان لفظوں میں دی کہ ’’آپ نے صرف کتاب کے مفہوم کو نہیں غالب کے اسلوب کو بھی اردو میں منتقل کر لیا ہے۔‘‘

میں اسے دہلی اور اہلِ دہلی کی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں کہ خاں صاحب ایک مدتِ مدید تک دہلی میں رہے۔ چند برس پہلے دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اپنے وطن شاہجہاں پور واپس چلے گئے تھے۔ کسی شہر میں ان جیسے لوگوں کی موجودگی اس شہر کے علمی اور ادبی منظر نامے کو وقار اور اعتبار بخشتی ہے اور وہاں کی تہذیبی زندگی کو تابانی اور درخشانی عطا کرتی ہے۔ خاں صاحب جن تہذیبی قدروں کے امین تھے موجودہ دور میں ان کی پامالی کا منظر عام ہے لیکن خاں صاحب سے مل کر یہ منظر جیسے دھندلانے لگتا اور حالی کا یہ مصرع مجسم ہو کر سامنے آ کھڑا ہوتا۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

خاں صاحب نے عمرِ طبیعی پائی۔ ان کے انتقال کی خبر ملنے سے تین چار روز پہلے، ان سے فون پر بات ہو رہی تھی، کہنے لگے: بھائی اب میں اسّی کے لپیٹے میں ہوں، کئی عوارض نے آ گھیرا ہے مگر بہت سے کام ہیں جو ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ میں نے کہا: خاں صاحب! ابھی آپ بہت جییں گے اور مزید کام کریں گے۔ اس وقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد سفر آخرت پر روانہ ہونے والے ہیں۔ خاں صاحب کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے، اسے پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ انھوں نے پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کی، اس خدمت کا بھرپور اعتراف بھی ہوا اور امید ہی کیا یقین ہے کہ آئندہ بھی ان کے کاموں کی قدر و قیمت محسوس کی جاتی رہے گی۔

□□□

اسلم پرویز

خاں صاحب

دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی روایت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے لیکن روایت کے ساتھ ہر شخص کا تعلق ایک سا نہیں ہوتا۔ بے شمار لوگ تو وہ ہیں جو اپنی روایت سے بے خبر اور بیگانے ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کے ہاں روایت کے زمانی ضابطوں کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور جو روایت کے بارے میں ایک طرح کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو روایت پرست کہا جا سکتا ہے۔ روایت پرستوں کو اس وقت زبردست بحران کا سامنا ہوتا ہے جب کسی عبوری دور کے زمانی ضابطے روایت کے چراغوں کی لو ماند کر دیتے ہیں جب کہ روایت پرست صرف انھی چراغوں کی روشنی میں راستہ چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جن کی شخصیت میں روایت کا امتزاج عقلی اور جذباتی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ گویا ان کے ہاں روایت کا عرفان اور احترام بھی ہوتا ہے اور اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی۔ ان لوگوں کو صحیح معنوں میں روایت کا امین کہا جا سکتا ہے۔ روایت کی مختلف جہات ہیں اور علاحدہ علاحدہ سیاق و سباق میں اُس کی الگ الگ سطحیں بھی۔ اس لیے کسی فرد واحد کے تعلق سے روایت کی تخصیص بھی ضروری ہے۔ اور جب تذکرہ رشید حسن خاں کا شروع ہوا ہے تو اس معاملے میں آپ یقیناً میرے ہم خیال ہوں گے کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جو ہماری قدیم ادبی روایت کے امین ہیں۔ روایت کی یہ امانت ان تک اور ان کے ساتھ ان کے کئی دوسرے ہم عصروں تک حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسی شخصیتوں کے سلسلے سے پہنچی ہے۔

روایت کے امین کا کام روایت کی جو ماضی کی امانت ہے، حال کی وساطت سے مستقبل تک پہنچانا ہے جو اس کا حقیقی وارث ہے۔ اس اعتبار سے گویا کسی روایت کے امین کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ماضی سے اپنی پیوستگی اور حال سے وابستگی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی نیابت کے فرائض بھی انجام دے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں اس لیے کہ یہاں تمام تر لیاقت اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی رویے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ذہنی رویہ ہے روایت کے معاملے میں ہر طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو جھٹک کر الگ کر دینے کا، ایک سائنٹفک نقطۂ نظر اختیار کرنے کا اور حال کی ناگزیر حقیقتوں کو کھلے دل اور دماغ کے ساتھ تسلیم کرنے کا۔ مختصر یہ کہ اس ذہنی رویے کا دوسرا نام ہے روشن دماغی۔ رشید حسن خاں یقیناً قدیم ادبی روایت کے پرستار اور دلدادہ ہیں لیکن اس میدان میں ان کی شہرت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ روشن دماغ بھی ہیں۔

تحقیق ایک سنجیدہ اور علمی کام ہے اگرچہ بعض لوگوں کی نظر میں یہ ایک انتہائی خشک موضوع ہے۔ رشید حسن خاں ایک خوش طبع انسان ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کھلا ذہن رکھتے ہیں اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں زمانۂ موجود کے انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر تحقیق ان کا موضوع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دقیانوسیت کی مکڑی نے ان کے گرد اپنا جال بن کر انھیں اس میں قید کر دیا ہو اور وہ ایسے ہی کرم کتابی لگنے لگے ہوں جیسی کرم خوردہ کتابوں سے انھیں عام طور پر واسطہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے قدیم ادب کے بہت سے گوشوں پر سے مکڑی کے جالے صاف کر کے انھیں آج کے سورج کی روشنی اور دھوپ دکھلائی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی صاحب جب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہوئے تو ان کے دل میں یہ خیال سمایا کہ اس شعبے کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچنا چاہیے۔ کسی شعبے کا وقار قائم ہوتا ہے ان شخصیتوں سے جو اس سے وابستہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ درس و تدریس کے علاوہ شعبے کے علمی اور ادبی منصوبوں کی تکمیل کے لیے خواجہ صاحب نے جن لوگوں کو یہاں لا کر جمع کیا اور جن کی بدولت شعبے کا وقار قائم ہوا ان میں خاص طور پر مولانا ضیاء احمد بدایونی، شمشیر بہادر سنگھ، رشید حسن خاں اور ترلوچن شاستری قابل ذکر ہیں۔ یہ لگ بھگ پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔

رشید حسن خاں جب دتی آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں ان کا قیام سرسید روڈ پر سرسید کے مکان میں رہا۔ جامع مسجد کے اطراف میں اس وقت ڈی.ڈی.اے. کا وہ بلڈوزر نہیں چلا تھا جو اور چیزوں کے ساتھ جامع مسجد کے ادبی ٹھکانوں کو بھی ڈھاتا ہوا نکل گیا تھا۔ چنانچہ روزانہ شام کو دہلی کی بیشتر ادبی شخصیتیں اردو بازار میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ، فلورا ہوٹل، میر مشتاق کے اردو ہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قائم بھائی ظہیر کے فرینڈز ٹی اسٹال المعروف بہ چنڈو خانہ پر جمع ہوتی تھیں۔ رشید حسن خاں کے ساتھ میری اور خلیق انجم کی تقریباً روزانہ شام کو یہیں ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی

کبھی ہم دونوں سرسید روڈ پر ان کی قیام گاہ پر بھی ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔ خلیق انجم اس زمانے میں کروڑی مل کالج سے وابستہ ہو چکے تھے اور میں بھی اپنے پی ایچ.ڈی. کے کام کے سلسلے میں تقریباً روزانہ ہی دہلی یونیورسٹی جاتا تھا لہٰذا اکثر دن کے اوقات میں بھی خاں صاحب کے ساتھ کیمپس میں ملاقات رہتی تھی۔ یہ تعلق رفتہ رفتہ اخوت کے رشتے میں بدلتا گیا۔ اس طرح رشید حسن خاں سے جو قربتیں حاصل ہوئیں ان کے ذریعے ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے۔ علمی پہلو بھی اور انسانی پہلو بھی۔ اور ہر پہلو انتہائی دلچسپ نظر آیا اور معلوم ہوا کہ وہ ایک باصلاحیت، روشن خیال اور دوست نواز انسان ہیں۔

اس گفتگو کے آغاز میں رشید حسن خاں کے تعلق سے روایت کے امین ہونے کا جو تذکرہ چھڑا تھا اسی کی روشنی میں رشید حسن خاں کے بارے میں ایک بات یہ کہنی ہے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری جھولی میں اپنی روایت کا جو کچھ بھی سرمایہ ہے اسے ہمیں پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے خردوں میں تقسیم کرتے رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب ادب کے طالب علموں کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہی نسل روایت کے مستقبل کے سفر کی ساتھی ہے۔ جن لوگوں کو رشید حسن خاں سے قربت حاصل ہے اور جو ان سے مسائل ادب پر صلاح و مشورہ کرتے رہتے ہیں ان کی تحریر و تقریر پر رشید حسن خاں کے کان اور نگاہ برابر لگے رہتے ہیں تاکہ ان کے ہاں اگر کہیں کوئی کوتاہی ہے تو وہ اس سے انھیں برملا آگاہ کردیں۔ نوجوانوں کی وہ نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ وہ انھیں نئے نئے موضوعات بھی تجویز کرتے ہیں اور متعلقہ ماخذوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ وہ اس نازک فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ طالب علم کس سلوک کے مستحق ہیں اور ادب کی قد آور شخصیتوں مثلاً پروفیسر محی الدین قادری زور اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ کے ساتھ علمی مجادلے کے کیا تقاضے ہیں۔

تحقیق اور متنی تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ پایے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں بلکہ تحقیق اور متنی تنقید کے اصول و ضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کے مرد میدان ہیں۔ ان کے تحقیقی قول و عمل میں تضاد ڈھونڈ نکالنا بہت مشکل ہے اور یہی دراصل کسی شعبۂ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب وہ خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کام انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خدا داد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سرانجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ وہ دونوں محاذوں پر چاق و چوبند ہیں۔

ہر شعبۂ علم میں اصلاح اور ترمیم کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیے تاکہ ہر زمانے میں اس میں تازگی اور توانائی برقرار رہے۔ یہ کام روایت پرستی کے بل پر نہیں بلکہ روایت سازی کی قوت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ رشید حسن خاں کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب ''اردو املا'' اس کی روشن مثال ہے۔ اس کتاب میں اردو املا سے متعلق انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد تک کے تمام مباحث کو سمیٹا ہے بلکہ سائنٹفک انداز میں املا میں مناسب اور موزوں اصلاحات اور تصحیحات کے ذریعے اس کو ایک معیاری شکل دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے عبارت میں رموزِ اوقاف کے استعمال پر شدت کے ساتھ زور دیا ہے، جس کا اردو میں خاطر خواہ رواج نہیں تھا۔ اسی طرح امالے کے سلسلے میں بھی انھوں نے ہمارے ذہن کو صاف کیا ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ املا سے متعلق آپ رشید حسن خاں کی ہر بات کو من و عن قبول کرلیں۔ ان کی بعض تجاویز سے لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ دوسری طرف ایسے اسکالر بھی ہیں جنھوں نے ''اردو املا'' کی بنیاد پر املا کے مسائل پر کتابچے شائع کر ڈالے حالانکہ ''اردو املا'' جیسی ضخیم کتاب کے بعد اگر ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس کتاب کی ایسی تلخیص تیار کی جاتی جس کے مطالعے سے اردو کے اساتذہ اور طلبہ کو یہ آگاہی بہم پہنچائی جاتی کہ عبارت کیسے لکھیں۔ یہ کام بھی بعد میں خود رشید حسن خاں نے انجام دیا۔ بہر حال املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی خصوصی دلچسپی آگے چل کر بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ میرے نزدیک ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کی تاریخی تدوین املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی اُسی دلچسپی کا ثمرہ ہے۔ اب آپ ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' میں رجب علی بیگ سرور اور میر امن دہلوی کو براہ راست بولتے ہوئے سن سکتے ہیں۔

رشید حسن خاں نے اس بات پر بھی بجا طور پر زور دیا ہے کہ تحقیق کی زبان صاف، سادہ اور دوٹوک ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک تحقیق، دلائل اور ثبوت کی بنیاد پر مروّجہ حقائق کے رد و قبول اور نئے حقائق کی دریافت کا عمل ہے، اس اعتبار سے عبارت آرائی، طولِ کلام، انشا پردازی، صفاتی الفاظ اور مغلق الفاظ کا استعمال تحقیق کے لیے غیر مناسب ہی نہیں نقصان دہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر دونوں میں بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اگرچہ ادبی تحقیق کا تعلق براہ راست ادب سے ہے لیکن بجائے خود تحقیق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسی ہی لچھے دار زبان میں گفتگو کرے جو سحر البیان، گلزار نسیم، فسانۂ عجائب، اور 'باغ و بہار' جیسی تخلیقات میں استعمال ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک

تحقیق کی زبان دستاویزی ہونی چاہیے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر دستاویزی زبان اپنے قاری کو گرفت میں کیسے لے۔ جان دار تحقیق میں جاسوسی ناول کا سسپنس ہوتا ہے۔ حقائق کی اندھی گپھا میں ٹٹول ٹٹول کر چلنے کا سسپنس۔ جو محقق یہ سسپنس پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے پھر دستاویزی زبان ہی راس آتی ہے۔

جیسا کہ میں جانتا ہوں رشید حسن خاں بنیادی طور پر عربی مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔ اُن کے پاس یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں۔ پھر بھی ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں وہ توسیعی خطبات دینے کے لیے بلائے جاتے ہیں، ایم.فل اور پی ایچ.ڈی. کے مقالات کے ممتحن بنائے جاتے ہیں۔ بمبئی، جموں، حیدر آباد اور دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں انھیں برابر دعوت دی جاتی ہے۔ ان کی جو قدر و منزلت ہندستان میں ہے وہی پاکستان میں بھی ہے۔ وہاں بھی لوگ ان کے ادبی منصب اور مرتبے سے پوری طرح واقف ہیں۔ مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسی پاکستان کی مقتدر شخصیتیں ان کی قدر دان اور مداح ہیں۔

جو شخص رشید حسن خاں سے ذاتی طور پر کبھی نہ ملا ہو وہ ان کے کارناموں اور شہرت کو دیکھ کر یہی اندازہ لگائے گا کہ یہ صاحب یقیناً کوئی مردم بیزار قسم کی چیز ہوں گے جو بس ہمہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتے ہوں گے اور باہر کی دنیا سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی لیکن رشید حسن خاں کے بارے میں ایسا کچھ نہیں۔ وہ بالکل نارمل انسان ہیں۔ وہ ایک طرف پرانی وضع داریوں اور رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں اور انتہائی سلیقے سے انھیں اپنی زندگی میں برتتے ہیں تو دوسری طرف ان کی زندگی کے مشاغل و معمولات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انھیں آج کے زمانے کا آدمی ثابت کرتی ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات کم نہیں ہیں لیکن انھوں نے یہ فتوحات سماجی رشتوں کی قیمت پر حاصل نہیں کیں۔ انھوں نے اپنے اوقات روز و شب کو پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ اپنے علمی کاموں، اپنے دوستوں اور عزیزوں اور مشاغل و تفریحات میں تقسیم کیا ہے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر خاں صاحب نے تحقیقی کام کا اتنا انبار کیسے لگا دیا۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سلامت روی اور وقت کے صحیح استعمال کے اصول پر قائم رہے ہیں۔ وہ اگر پٹھان ہیں تو اسی حد تک کہ غلط آدمی اور غلط بات کے ساتھ کبھی مصالحت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں قابلِ رشک توازن اور اعتدال ہے۔ اپنے علمی مشاغل پر وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند گھنٹے صرف کرتے ہیں اور اپنے اس معمول پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اپنے اس استقلال کے بل پر وہ لمبی لمبی قلانچیں بھرنے والے خرگوشوں کو جھاڑیوں میں سوتا چھوڑ کر فتوحات کے جھنڈے گاڑتے چلے جا رہے ہیں۔

خاں صاحب یعنی رشید حسن خاں کو دہلی یونیورسٹی کے گوائر ہال میں رہتے لگ بھگ تیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ گوائر ہال کے عملے، ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ اور اساتذہ سب کے ساتھ خاں صاحب کے خوشگوار تعلقات ہیں۔ یہ تمام لوگ خاں صاحب کے روزانہ کے معمولات سے بھی باخبر ہیں اس لیے کہ ان معمولات میں کبھی سرِ مو فرق نہیں آتا۔ اگر آپ کسی وقت بنا بتائے خاں صاحب سے ملنے گوائر ہال چلے جائیں اور وہاں خاں صاحب کے کمرے پر تالا لگا ہوا پائیں تو آس پاس کے لوگ بتا دیں گے کہ خاں صاحب اس وقت کہاں ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ گیٹ پر بیٹھے چوکیدار ہی سے خاں صاحب کے بارے میں پوچھ لیں تو وہی بتا دے گا کہ خاں صاحب نکل چکے ہیں یا ابھی نہیں نکلے ہیں۔ خاں صاحب کے معمولات یہ ہوتے ہیں کہ صبح ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد تیار ہو کر ساڑھے سات بجے تک ڈائننگ ہال پہنچ جاتے ہیں۔ ڈائننگ ہال میں ان کی نشست مخصوص ہے، ہمیشہ وہیں بیٹھتے ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آٹھ بجے ڈائننگ ہال سے نکل کر کمرے پر واپس نہیں جاتے بلکہ سیدھے دہلی اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی میز مخصوص ہے جہاں وہ ایک گھنٹہ بیٹھتے ہیں۔ کافی ہاؤس کے بیرے ان کے مزاج اور مذاق سے بخوبی واقف ہیں ان سے صرف مسکراہٹ کی زبان میں گفتگو ہوتی ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے کافی ہاؤس کے بعد کی اگلی منزل شعبۂ اردو ہوا کرتا تھا جہاں سے ایک بجے سے کچھ پہلے لنچ کے لیے اٹھ جایا کرتے تھے اس دوران کبھی کبھی اگر میں مل گیا تو مجھے بھی لنچ کی دعوت دے کر ساتھ گوائر ہال لیتے گئے۔ گوائر ہال کے باہر ایک کارندہ میز بچھا کر بیٹھتا ہے جو گیسٹ ٹکٹ کاٹتا ہے۔ ہال کے ممبر یہاں پہلے پیسے دے کر اپنے مہمان کا ٹکٹ لیتے ہیں پھر کھانے کے ہال میں داخل ہوتے ہیں لیکن یہ کارندہ بخوبی جانتا ہے کہ خاں صاحب کی اپنے مہمان کو کھانا کھلانے کی تہذیب کیا ہے۔ خاں صاحب اپنے مہمان کو لے کر سیدھے کھانے کی میز پر پہنچتے ہیں۔ مہمان کے ساتھ مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں کھانا بھی چل رہا ہے اور اسی دوران نہ جانے کب بحسن و خوبی گیسٹ ٹکٹ والا معاملہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ شام کو خاں صاحب کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں بھی اسی انداز سے رونق افروز ہوتے ہیں لیکن آپ ہر جگہ ان کو تنہا پائیں گے۔ کسی کافی ہاؤس میں نہ وہ کسی کی میز پر جاتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا ان کی میز کی طرف رخ کرتا ہے۔ خاں صاحب اپنے زمانے میں ہاکی کے کھلاڑی تھے اس لیے دہلی کے شیواجی اسٹیڈیم میں ہونے والے ہاکی کے میچ اور امبیڈکر اسٹیڈیم میں فٹ بال کے میچ بھی وہ اتنی ہی پابندی سے دیکھتے تھے

اور یہاں بھی وہ ہمیشہ تنہا دیکھے جاتے تھے۔ ادھر کچھ برسوں سے ان کا یہ شوق کچھ ہو گیا ہے۔

مجھے جب کبھی خاں صاحب سے کوئی صلاح مشورہ کرنا ہوتا تو میں صبح ساڑھے سات بجے سے کچھ پہلے خاں صاحب کے پاس گوائر ہال پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے گوائر ہال پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات سے کچھ اوپر ہو گئے۔ دیکھا تو خاں صاحب کے کمرے میں تالا پڑا ہوا ہے میں سمجھ گیا ڈائننگ ہال گئے ہیں۔ آٹھ بجے تک آ جائیں گے۔ میں انتظار میں کمرے کے آگے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے آٹھ بجے، پھر آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو گئے لیکن خاں صاحب نہیں لوٹے۔ کچھ دیر اور انتظار کر کے ڈائننگ ہال کے سامنے پہنچا۔ بیرے سے پوچھا تو پتا چلا آٹھ بجے نکل چکے، ناشتا کر کے۔ دوڑ کر گیٹ پر آیا تو چوکیدار نے بتایا خاں صاحب تو گئے باہر۔ اب میں دوڑتا بھاگتا اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں خاں صاحب مزے سے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے آؤ برادر۔ اسی کے ساتھ بیرے کو کافی کا اشارہ ہوا۔ میں نے کہا: خاں صاحب! مجھے پانچ منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ آپ کے کمرے کے آگے ٹہلتا رہا کہ آپ ناشتے سے فارغ ہو کر ادھر آئیں گے اور آپ سیدھے نکل آئے۔ خاں صاحب نے کہا جب آپ وقت مقررہ پر نہیں آئے تو میں نے سمجھا آج آپ گول ہو گئے، میں بھی اپنے رستے ہو لیا۔ ایک دو بار اور میرے ساتھ یہی ہوا۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ یہ طے ہوا کہ اگر میں آپ کے ناشتے پر جانے سے پہلے نہ پہنچ پاؤں تو سمجھ لیجیے لیٹ ہو گیا ہوں۔ اب ناشتے کے بعد آپ سے ملاقات ہوگی اس لیے آپ ناشتے سے فارغ ہو کر اسکول آف اکنامکس جانے کے بجائے کمرے پر ہی واپس آ جائیں۔ اس پر خاں صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ کسی روز سرے سے آئے ہی نہیں تو میرا تو سارا معمول درہم برہم ہو جائے گا۔ میں نے یقین دلایا کہ ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔

خاں صاحب لباس کے بارے میں بھی وضع کے پابند ہیں۔ گرمیوں میں بوشرٹ، پتلون اور چمڑے کے براؤن رنگ کے سینڈل پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں پوری آستین کی قمیص، پتلون اور وہی براؤن رنگ کا لیس والا جوتا۔ بوشرٹ اور قمیص ہمیشہ چیک کی ہوتی ہے۔ ہاتھ پر ویسٹ لینڈ کمپنی کی گھڑی۔ خاں صاحب کے کمرے پر جائیے تو ان کی میز پر چمک دار سکوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی ہوئی ملیں گی۔ پوچھنے پر پتا چلے گا کہ یہ بس کے لیے ہیں۔ خاں صاحب بس میں کنڈکٹر کو کبھی بڑا نوٹ نہیں دیتے۔ ہمیشہ پورے پورے پیسے دیے اور جلد سے جلد اس سے خلاصی حاصل کی۔ وہ کنڈکٹر کو نوٹ دے کر جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ یہ کہے کہ ٹھہریے باقی پیسے بعد میں دوں گا۔ یا اگر دے تو پھٹے پرانے نوٹ پکڑا دے جس سے اس کے ساتھ ایک اور جھک جھک میں پڑنا پڑے گا۔

رشید حسن خاں یاروں کے یار ہیں۔ منافقت سے انھیں سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کی بے تکلفی ہے ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی ہے لیکن عام طور پر وہ کم آمیز ہیں۔ اس لیے ہر کس و ناکس کے ساتھ ہنسی مذاق تو کیا بات بھی احتیاط سے اور مختصر کرتے ہیں۔ یوں کہیے کہ بات کرتے ہی نہیں۔ بعض دوستوں کے ساتھ گاہے گاہے جا کر خود ملاقات کرنا بھی ان کی وضع داری میں شامل ہے۔ ان میں ایک تو غلام ربانی تاباں مرحوم تھے۔ ان کے علاوہ بیگم ممتاز مرزا اور مخمور سعیدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

چونکہ خاں صاحب ادب کے قدیم سرمایے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ تنہا اس سمندر کے تمام موتی نہیں چن سکتے، اس لیے وہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے موضوعات سوچتے رہتے ہیں۔ یہ موضوعات وہ ان نوجوانوں کو تجویز کرتے ہیں جو تحقیق کے میدان میں نئے نئے وارد ہو رہے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی وہ رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ جنھوں نے مکتب کی بھی تعلیم حاصل کی ہے انھیں تو خاص طور پر وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب سے متعلق موضوعات پر ہی ریسرچ کریں خاص طور پر اس لیے بھی کہ آج کے زمانے کا ہر طالب علم اس طرح کے موضوعات پر تحقیق کرنے کا اہل نہیں۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں رشید حسن خاں کو روایت کا امین کہا تھا اور اس حیثیت سے انھیں روایت پرستوں سے ممتاز قرار دیا تھا۔ لہٰذا اپنی اب تک کی تمام گفتگو میں میں برابر یہی کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے ہاں روایت کے عرفان اور احترام کے ساتھ اس کی توسیع اور بقا کا بھی جذبہ ہے۔ یہ اجداد کی رہنمائی میں اخلاف کو قیادت سونپنے کا عمل ہے۔ روایت کے عرفان اور احترام کے لیے عقل و ادراک کی ضرورت ہے اور اس کی توسیع اور بقا کے لیے قوتِ عمل اور جوش کی۔ یعنی یہ ایک دیوانگی عقل کا سودا ہے جسے میر نے شعور سے جنوں کرنے کا نام دیا ہے۔

خوش ہیں دیوانگیِ میر سے لوگ   کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

اور یہ بھی کہ:

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو

رشید حسن خاں کی شخصیت اس توازن کی بہترین مثال ہے۔

* * *

اشفاق محمد خاں

رشید حسن خاں

1963 کا واقعہ ہے کہ ایک دن مجھے ڈاکٹر عبدالعلیم (1) (مرحوم) نے بلا کر دریافت کیا کہ ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی کتنی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں؟ میں نے موصوف کو فوراً تعداد (غالباً دس یا بارہ) بتا دی۔ علیم صاحب نے مجھے ایک خط رجسٹرار یونیورسٹی کا دکھایا اور فرمایا کہ اب اس کتاب کی فروخت بالکل بند کر دیجیے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ اس قدر اہم تاریخ کی کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔

ہاں صاحب تو ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی فروخت بند کر دی گئی۔ میں نے دوسرے دن آفس جا کر علیم صاحب سے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگائے جانے کی آخر وجہ؟

(علیم صاحب کو جن حضرات نے قریب سے دیکھا ہے، شاید وہ درج ذیل گفتگو کی تصویر کشی سے محظوظ ہو سکیں گے۔)

میرے اس سوال پر محترم کے سُرخ چہرے کی سرخی دگنی ہو گئی اور حسب عادت غصّے والی کیفیت کے ساتھ ایک لمحے کے لیے سر اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فوراً سر جھکاتے ہوئے بولے: آپ کو نہیں معلوم؟

میں: جی نہیں۔

علیم صاحب: وہ بے شمار اغلاط کا مجموعہ ہے۔

میں: کس طرح کی اغلاط ہیں صاحب؟

علیم صاحب: (جھنجھلا کر) یہ سرور صاحب سے جا کر پوچھیے۔ بس اتنا سن کر میں کرسی پر سے اٹھا اور دو قدم ہی چلا تھا کہ (حسب معمول)

علیم صاحب: ذرا سنیے۔

میں: جی، ارشاد۔

علیم صاحب: ابھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔

میں: بہتر ہے۔

(جیسے ہی مڑا تھا کہ حسب عادت)

علیم صاحب: اور ہاں سنیے۔

میں: جی فرمائیے۔

علیم صاحب: ایک جلد اس تاریخ کی کل چپراسی کے ہاتھ میرے گھر بھجوا دیجیے۔

میں: کیا آپ نے ابھی تک اس تاریخ کو نہیں دیکھا؟

علیم صاحب: جی نہیں۔ اس پر جو تبصرہ رسالہ ''تحریک'' میں رشید حسن خاں کا شائع ہوا ہے، بس وہ پڑھا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیجیے۔

راقم الحروف کا رشید حسن خاں صاحب سے غائبانہ تعارف پہلی بار علیم صاحب کے مزید اس جملے سے ہوا: ''ارے بھئی رشید حسن خاں کے تبصرے نے اس تاریخ کی فروخت پر پابندی لگوا دی ہے۔''

تیسرے دن جب میں آفس ذرا دیر سے پہنچا تو احباب سے معلوم ہوا کہ علیم صاحب مجھے دریافت کر رہے تھے۔ میں فوراً علیم صاحب کے پاس گیا۔ علیم صاحب نے چپراسی کی زبانی کہلا بھیجا کہ جن جن بک سیلرز کے پاس یہ کتاب پہنچ چکی ہے، اگر ممکن ہو تو واپس منگوا لیجیے۔

مختصر یہ کہ رشید حسن خاں کے تبصرے نے یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر اردو کی باقی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اس حادثے کی اطلاع اخبارات تک پہنچ گئی۔ اس تاریخِ ادب، کے متعلق ''صدقِ جدید'' لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا ایک بیان شائع ہوا تھا، پہلے اسے ملاحظہ فرمائیں:

''ایک ذمے دار تبصرہ نگار رشید حسن خاں صاحب (دہلی یونیورسٹی) کے قلم سے ماہنامہ ''تحریک'' (دہلی) میں:

''کتاب کا سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصہ اس کا پہلا باب ہے جس کا عنوان ہے ''سیاسی اور تمدنی پس منظر''۔ اس باب کی تین خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعی طور پر کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے، بیشتر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے...... دوسری یہ کہ مقالہ نگار نے جگہ جگہ ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے جو بہت سے لوگوں کی دلآزاری کا سبب بن گیا...... مقالہ نگار کو اس کا حق ہے کہ وہ عظیم المرتبہ صوفیہ کو خیرات خوار سمجھیں۔ اورنگ زیب کو دنیا کا بدترین حکمراں مانیں۔ اکبر کے دینِ الٰہی کو منشورِ انسانیت قرار دیں۔ ان کو یہ بھی حق ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں کے خالص حکومتی اقدامات کو ''مسلم آئینِ حکمرانی کے مسلمہ اصول'' قرار دے کر طنز و تعریض کے تیروں سے اپنا ترکش خالی کریں اور اسی طرح اپنی وسیع الخیالی یا قوم پرستی کی صفت میں کچھ اور اضافہ کر لیں۔ لیکن ان کو اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ تاریخ ادب کی کسی ایسی کتاب میں جو محض ان کے اندازِ فکر کی ترجمانی کے لیے مرتب نہیں کی گئی ہے، ان مفروضات کو پیش کر کے نارسیدہ طلبہ کو اپنے مخصوص خیالات کی

تلقین کا نشانہ بنائیں۔ تاریخ ادب کی کتابیں اس لیے مرتب نہیں کی جاتیں کہ ان سے کوئی شخص اپنے ذاتی خیالات کی نشرواشاعت کا کام لے، جب کہ ایک قابل ذکر گروہ ان کو غلط سمجھتا ہو۔"

ذکر علی گڑھ کی " تاریخ ادب اردو" کا ہے جس کی تیاری کا غلغلہ مدت سے بلند تھا اور جس کی تحریر و ترتیب کے لیے شہرہ یہ تھا کہ یہ جدید مغربی اصول پر ہوگی اور اس کے ایڈیٹر سرور صاحب ہوں گے۔ کتاب میں علمی و تاریخی تحقیقی حیثیتوں سے جو عیب بہ کثرت موجود ہیں، ان کی افسوس ناک تفصیل تو رشید حسن خاں صاحب کے اصل مقالے میں ملے گی۔ یہاں ذکر صرف اس کے مذہبی و ملی پہلو کا ہے۔ کون فرض کر سکتا تھا کہ مسلم آزاری کا یہ ریکارڈ ایک "مسلم" ادارہ (یعنی مسلم یونیورسٹی کا ایک شعبہ) قائم کرے گا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی ہجو تو بہتوں کا شعار رہ چکا ہے۔ مسلم آئین حکومت کی بدگوئی کرنے والے بھی دنیا میں کم نہیں ہیں۔ صوفیائے کرام کی تحقیر و توہین سے بھی آلودہ بہت سے قلم رہ چکے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ ان مباحث عالیہ کے لیے جگہ " تاریخِ ادب اردو" کے سے بے ضرر موضوع میں بھی نکال لی جائے گی اور تاریخ ادب اردو کے ذہین و طبّاع ایڈیٹر صاحب انھی لوگوں کے سُر میں سُر ملانا قرینِ مصلحت تصور فرمائیں گے۔" (صدق جدید، 8 نومبر 1963)۔

" صدق جدید" میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی یہ تحریر پڑھنے کے بعد وہ حضرات بھی جو تاریخ کی فروخت پر پابندی لگانے کو سرور صاحب وغیرہ کے خلاف ایک سازش تصور کر رہے تھے، بالکل خاموش ہو گئے اور اسی میں نی نجات و فلاح سمجھی کہ اب رشید حسن خاں صاحب کے تبصرے پر کوئی تبصرہ کیا جائے۔ 15 فروری 1964 کے " صدق جدید" میں درج ذیل عنوان کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی دوسری تحریر شائع ہوئی۔

" ایک صحیح فیصلہ۔ بڑی مسرت کے ساتھ دہلی کے ماہ نامہ " تحریک" میں یہ خبر پڑھنے میں آئی:

" اردو ادب اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ " علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی فروخت روک دی گئی ہے۔ تحریک میں اس کتاب پر جو تبصرہ شائع ہوا اس کی اردو کے مشہور ترین اخباروں، جریدوں اور ارباب ادب نے تائید کی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ارباب اقتدار نے رائے نامہ کا احترام کیا اور اس کتاب کی فروخت کو بند کر دیا جو ایک ایسے تعلیمی دارے کی پیشانی پر داغ تھی جو درخشاں روایات کا حامل ہے۔ اس سے (فلاں اور فلاں صاحب) کی رسوائی میں تو ضرور اضافہ ہوگا لیکن یونیورسٹی کی پیشانی سے داغِ رسوائی دھل جائے گا۔ ہم اس فیصلے کے لیے ارباب بست و کشاد کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔"

بیشک یہ فیصلہ قابل مبارک باد ہے اور ملت کا صحیح احتجاج کامیاب رہا لیکن اس کی اصلی داد رشید حسن خاں صاحب کو ملنی چاہیے جن کا تبصرہ واقعی بصیرت افروز تھا۔ کیا اچھا ہو کہ اب کتاب نظر ثانی و ترمیم کے لیے جن صاحبوں کے سپرد کی جائے اس جماعت کے ایک رکن خود رشید حسن خاں صاحب ضرور رہوں۔" (صدق جدید۔ 15 فروری 1964)

اس ہنگامے کے بعد ہوا یہ کہ لوگ اس تاریخ کا نام تو بھول گئے مگر اس کے حوالے سے رشید حسن خاں صاحب کے نام، ان کے ادبی، تحقیقی کارناموں اور تنقیدی صلاحیتوں کی جستجو میں لگ گئے۔ خاں صاحب اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے اور راقم الحروف ایم.اے.، پی ایچ.ڈی۔ کے چکر میں علی گڑھ میں بھلے برے دن گزار رہا تھا۔ فارغ التحصیل ہوکر جب میں روزگار کی تلاش میں دہلی پہنچا تو وہاں پرانے احباب پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی اور اتفاق سے مجھے بھی یہاں روزگار نصیب ہو گیا۔ ان دونوں احباب کی وساطت سے ایک ایسی بھی مبارک گھڑی آئی کہ میری ملاقات رشید حسن خاں صاحب سے ہوئی۔ چند ملاقاتوں میں ہی خاں صاحب کی دلکش، دلچسپ اور عالمانہ شخصیت نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا اور کچھ ایسا محسوس ہوا گویا مجھے کوئی کھوئی ہوئی قیمتی شے مل گئی ہو۔ بہر حال اس قربت سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ میں نے اپنے ایم.فل کے طلبہ کے تحقیق و تدوین سے متعلق کورس کی تیاری کے سلسلے میں خاں صاحب کو لکچر دینے کے لیے زحمت دینا شروع کر دی۔ خاں صاحب نے ہمیشہ میری دعوت قبول کی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ راقم الحروف بھی ان کے بیش قیمت لکچرز سے مستفید ہوا۔

مخدومی رشید حسن خاں صاحب میرے بزرگ ہیں۔ میں ذاتی طور پر " بزرگی بعقل است نہ بسال" کا قائل ہونے کی بنا پر خاں صاحب کی بزرگی اور برتری کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کی بزرگی اور برتری اس کی شخصیت جن عناصر سے تعمیر و تشکیل پاتی ہے ان پر منحصر ہے۔ ان عناصر میں اول عقل و دانش والی صفت ہے۔ دوم، مرتبۂ علم و فضل اور کمالِ فن ہے اور سوم جسے ہم عام طور پر " عظمتِ کردار" کہتے ہیں۔ ان تین عناصر سے مرتب شخصیت کو بزرگ اور برتر ہونے کا اہل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرِ دست میں اس طرح کی بزرگ و برتر شخصیت کا نام رشید حسن خاں تجویز کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ بلاشبہ ان کی شخصیت میرے نزدیک سر تا پا آدمیت سے عبارت ہے۔ مزید برآں یہ کہ رشید حسن خاں صاحب جن کے اسلاف اگر تلوار کے دھنی تھے تو خود رشید حسن خاں کے حصے میں ایک ایسا قلم آیا ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ دھاردار ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری پر قلم اٹھانے کی جرأت خاں

صاحب سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی۔ انھوں نے روایتی تنقید نگاری سے ہٹ کر اپنے منفرد اسلوب اور منفرد تنقیدی نقطۂ نظر سے ''فیض کی شاعری کے چند پہلو'' پر جس انداز سے تبصرہ فرمایا ہے یہ انھی کا حصہ ہے اور سچ یہ ہے کہ خاں صاحب سے میری دلچسپی، قربت اور یگانگت کا دوسرا پہلو یہ مضمون بھی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی طبیعت کے مطابق خاں صاحب کے تمام تنقیدی مضامین جو ان کے مجموعے ''تلاش وتعبیر'' میں شامل ہیں، ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ عرصۂ دراز کے بعد کسی کتاب کے پڑھنے میں بڑا ہی مزا آیا۔ خاں صاحب کا شایستہ لہجہ، شگفتہ زبان اور رواں دواں اسلوب میں حقائق کا بے باکانہ بیان دماغ کی بند کھڑکیوں کو کھولتا چلا جاتا ہے۔ درج ذیل بیان آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''فیض کی اکثر غزلیں سپاٹ اور سرسری اشعار کا مجموعہ ہیں۔ اس کے علاوہ زبان و بیان کے ایسے معائب ان میں موجود ہیں کہ خوش مذاقی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ کہیں بندشیں سست ہیں، کہیں تعبیرات ناقص ہیں اور کہیں یہ صورت ہے کہ ایک مصرع ترشا ہوا ہے اور دوسرا مصرع اس کے برابر کا نہیں۔ ردیفیں جگہ جگہ اُکھڑی سی ہیں۔ اور بہت سے قافیوں کو جن پہلوؤں سے بٹھایا گیا ہے وہ زبان حال سے فریاد کناں ہیں۔ بہت سے اشعار میں مفرد لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں بے طرح بے پروائی سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے زبان کے بڑے عیب اور بیان کے واضح اسقام نمایاں ہو گئے ہیں......''

(تلاش وتعبیر، صفحہ 97)

یہ تبصرہ پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ شاید اس لیے کہ اس سے قبل فیض کی شاعری پر اس طرح کا بے باکانہ تبصرہ یا تنقید میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ ہم سب ترقی پسند فیض کی ذات اور ان کی تخلیقات سے شاید اندھی عقیدت رکھتے تھے اور ان کو نہایت منکسر مزاج، علم دوست، بے نیاز اور بے غرض انسان سمجھتے تھے مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا اور غالباً رشید حسن خاں کی اس طرح کی تنقید کا نتیجہ ہی یہ ہوا کہ لندن کے فیض سیمینار میں شرکت کرنے والے مندوبین اور مقالہ نگاروں کی فہرست جب آخری منظوری کے لیے فیض صاحب کے سامنے پیش کی گئی تو اس فہرست میں سے کئی نام فیض نے نکال دیے۔ ان نکالے گئے ناموں میں سے ایک نام رشید حسن خاں صاحب کا بھی تھا (ایک معتبر راوی کی روایت کے مطابق۔)

میں رشید حسن خاں صاحب کو گروہ بند یا نظریہ ساز قسم کے ناقدین سے الگ ادب کا ایک منفرد، معتبر اور غیر جانب دار ناقد تسلیم کرتا ہوں اور ان کی ذات میں وہ تمام عالمانہ، ناقدانہ اور مردم شناسی کے اوصاف پاتا ہوں جن کی بنا پر غالب نے کہا تھا:

تھی جگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

بلاشبہ ایسی نکتہ سنج، پاکیزہ اخلاق پسندیدہ اور روح بالیدہ صفات کے حامل انسانوں کو شاید ہمیشہ زندگی کے بے پناہ تلخ وترش حقائق کا ذائقہ شناس ہو کر طرح طرح کے نشیب وفراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاں صاحب نے بھی بڑی ریاضت، بے حد مشقت، شرافت، دیانت اور نفاست کے ساتھ زندگی کے حقائق کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ مردانہ وار مقابلہ بھی کیا ہے۔ دریوزہ گری اور بے جا انانیت ان کا مزاج نہیں۔ وہ خودداری، اعلاظرفی اور کچھ کچھ قلندری جیسی صفات و اقدار کا ایک حسین تہذیبی گلدستہ ہیں جن کے پاس گھنٹوں بیٹھیے، کچھ سنیے، کچھ سنایئے۔ کچھ سیکھیے اور خوش خوش اٹھیے۔

تحقیق کے سلسلے میں ہمارے علمائے کرام نے بہت کچھ لکھا ہے اور طرح طرح کی تعریفات اور اصلاحات سے لفظِ ''تحقیق'' کے معنی اور مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تحقیق کا کام تنقید سے زیادہ جان لیوا ہے اور اس کا عملی حق وہی محقق ادا کر سکتا ہے جس کی فطرت میں تلاش وجستجو کا مادّہ ہو، اور وہ اشیا کو دو دو چار کے حساب سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز خود محقق کی شخصیت اور کردار حق گوئی اور بے باکی صفات سے آراستہ ہو۔ بصورتِ دیگر کوئی بھی محقق اور ناقد کسی طرح کے علمی اور ادبی کارناموں کے تحقیقی اور تنقیدی رشتوں، موضوع اور ہیئت کی نسبتوں، زبان و بیان کی لطافتوں، نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہے گا اور اس کی تحقیق وتنقید لفظوں کے کھیل سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل نہیں ہو سکے گی۔ ہمارے بعض صاحب بصیرت و بصارت نقاد اس راز کو دانستہ طور پر نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ اپنی کمزوریوں اور ناقص فکر اور پُرفریب طرز زندگی کی پردہ پوشی کی خاطر طرح طرح کی اصطلاحیں گڑھتے رہتے ہیں۔ مثلاً مثبت تحقیق اور منفی تحقیق کی اصطلاحیں، جو راقم الحروف کی سمجھ سے کم از کم بالاتر ہیں۔ تحقیق کا تعلق حق وصداقت سے ہوتا ہے، اس لیے تحقیق صرف تحقیق ہے نہ کہ مثبت اور منفی۔

بلاشبہ رشید حسن خاں صاحب کے تحقیقی کارناموں اور مشاغل کو ہم حق و صداقت کے اعلا معیار پر رکھ سکتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ عصرِ حاضر میں ان کی تحقیقی سرگرمیاں اردو زبان و ادب کے سرمایے میں ایک بیش بہا اور مثالی اضافہ ثابت ہوں گی۔

---

(1) علیم صاحب اس زمانے میں صدر شعبۂ عربی، ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز اور ڈائرکٹر یونیورسٹی پبلکیشنز تھے اور میں پبلکیشنز کا آفس انچارج تھا۔

□□□

گیان چند جین

خدائے تدوین

رشید حسن خاں کی جملہ کتابوں پر لکھنے کے لیے کم از کم ایک سال کی مدت چاہیے تاکہ سو ڈیڑھ سو صفحوں کا سیر حاصل مقالہ تسوید کیا جا سکے۔ زندگی مختصر مجھے اتنی مہلت دینے کو تیار نہیں، میں اپنے تصنیفی کام میں معروف ہوں اس لیے مختصراً رشید حسن خاں کی دو شاہکار تدوینوں کی داد دوں گا لیکن اس سے پہلے ان کی بعض اور کتابوں کے بارے میں دو حرف۔

مکتبۂ جامعہ نے معیاری سیریز شروع کیا جس کے تحت قدیم ادب کی کتابیں صحت متن اور ضروری فرہنگ کے ساتھ شائع کیں۔ ان کی قیمت کم رکھنے کے لیے متعلقات متن کو طول نہیں دیا۔ ''کتاب نما'' کی ایک حالیہ فہرست کے مطابق رشید حسن خاں نے اس سلسلے کے لیے ذیل کی کتابیں تیار کیں:

باغ و بہار، سحر البیان، گلزار نسیم، انتخابِ ناسخ، موازنۂ انیس و دبیر، حیاتِ سعدی، انتخاب مضامین شبلی، دیوانِ درد، مقدمۂ شعر و شاعری۔

میرے پاس ان میں سے کچھ کتابیں ہیں، بقیہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سب سے اہم ''باغ و بہار'' اور ''انتخاب ناسخ'' ہیں۔ معیاری سیریز میں ''انتخاب ناسخ'' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں تقریباً سوا سو صفحوں کا مقدمہ ہے، عام طور سے اس سیریز میں دو چار صفحوں کا مقدمہ ہی ہوتا ہے۔ میں نے اس انتخاب پر تبصرہ کیا تھا جو پہلے ''کتاب نما'' میں شائع ہوا اور پھر میرے مجموعۂ مضامین ''ذکر و فکر'' میں۔ اس مقدمے کے کئی پہلو قابلِ ذکر ہیں جن میں اہم ترین یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ ناسخ نے اصلاح زبان کے ضابطے بنائے تھے۔ انھوں نے کئی اقتباسات سے ثابت کیا کہ یہ ضابطے ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے بنائے تھے۔ مقدمے کا اتنا ہی اہم حصہ ناسخ کے رنگ سخن کی تعین ہے۔ اس میں رشید حسن خاں کامیاب نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

تلاش و تحقیق کی بنا پر تنقید کرنا ان کا رنگ خاص ہے۔ فیض اور جوش کے متعلق ان کی تنقیدیں مشہور ہیں۔ ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ''تلاش و تعبیر'' کے نام سے سامنے آ چکا ہے۔

معیاری ادب سیریز کی باغ و بہار، سحر البیان اور گلزار نسیم میں متن تو معتبر ہے ہی ان میں شامل فرہنگ بھی بہت مفید ہے۔

رشید حسن خاں قاضی عبدالودود کے پیرو ہیں۔ حالیہ دو شاہکار تدوینوں سے پیشتر ان کی شہرت ایک خوردہ گیر محقق کی تھی۔ اس سلسلے کے ان کے بعض مضامین ان کے مجموعے ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' (علی گڑھ 1978) میں ملتے ہیں۔ ان میں تین تبصراتی مضامین اہم ترین ہیں۔ دیوان غالب صدی ایڈیشن، اردو شاعری کا انتخاب اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تینوں تبصرے یک رُخی ہیں یعنی ان میں محض اغلاط دکھائی ہیں، خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔

دیوان غالب صدی اڈیشن کے مرتب مالک رام ہیں۔ اس پر خاں صاحب کا تبصرہ پہلے رسالہ ''تحریک'' دہلی غالب نمبر 1969 میں شائع ہوا، بعد میں ''اردو تحقیق اور مالک رام'' نام کی کتاب میں اور تیسری بار ان کے مجموعے ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' میں۔

خاں صاحب نے یہ تبصرہ بڑی دیدہ ریزی اور عمق نظر سے لکھا ہے۔ کاش انھوں نے غیر جذباتی رنگ میں لکھا ہوتا اور خامیوں کے بیان کے ساتھ مالک رام کے اکتسابات کا بھی اعتراف کیا ہوتا۔ رشید حسن خاں کے اعتراضات اور تجاویز میں سے میں بیشتر سے متفق ہوں بعض سے نہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔ جسے اس سے دلچسپی ہو وہ میرا مضمون ''مالک رام بحیثیت ماہر غالبیات'' دیکھ لے جو میرے مجموعے ''ذکر و فکر'' (الٰہ آباد 1980) میں شامل ہے۔

دوسرا اہم تبصرہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ ''اردو شاعری کا انتخاب'' پر ہے۔ انتخاب ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے اس میں تحریف متن کے جو نمونے دیے اور انتخاب میں عدم توازن کی نشاندہی کی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ڈاکٹر زور نے خود نہیں کیا بلکہ کسی شاگرد سے کرایا ہے۔ تیسرا شہرت یافتہ تبصرہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر ہے۔ رشید حسن خاں نے اس تاریخ کی خامیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مشہور ہے کہ ان کے تبصرے کے بعد کتاب بازار سے واپس لے لی گئی۔

صحتِ زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا شاہکار ان کی ضخیم کتاب ''اردو املا'' (ترقی اردو بورڈ، دہلی 1974) اور دوسرا شاہکار اسی ادارے سے شائع شدہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''زبان اور قواعد'' (دہلی 1976) ہے۔ ان کتابوں میں انھوں نے زبان کے مسائل پر جس علم و فضل اور قدیم کتب میں جس گہری نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے زمانے میں تقریباً نایاب ہے۔ ''اردو املا'' میں انھوں نے متعدد الفاظ کے جس تلفظ اور املا کی سفارش کی ہے ان میں سب

سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو اسناد پیش کی ہیں انھیں رد کرنا آسان نہیں۔ ''زبان اور قواعد'' کے مضامین میں جن قدیم کتب اور رسالوں سے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں ان میں سے بعض کا ہم نام لیا کرتے ہیں، انھیں دیکھتے نہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسے مآخذ ہیں جن کو ہم نے، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اردو کے کلاسیکی دفینے پر ایسی نظر اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کی ہو۔ مجموعے کے آخر میں انھوں نے بحر لکھنوی کا رسالہ ''بحر البیان'' پورے کا پورا شامل کر دیا ہے۔ یہ خوب کیا۔

رشید حسن خاں نے مالک رام کے مرتبہ دیوان غالب پر اعتراض کیا۔ ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا تھا کہ 'حضرت دوسروں کے بخیے تو بہت ادھیڑ چکے کچھ خود بھی کر کے دکھایئے تاکہ معلوم ہو کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔ خاں صاحب نے اس ساکت سوال کا مسکت جواب دیا اور جواب بھی ایک نہیں دو دو۔ انھوں نے پہلے فسانۂ عجائب کی اور پھر باغ و بہار کی تدوین کی اور اس طرح کی کہ آگے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ میں دونوں کارناموں کا تعارف پیش کرتا ہوں۔

فسانۂ عجائب:

اسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ سنہ اشاعت 1990 درج ہے لیکن رشید حسن خاں نے مجھے اس کتاب کی جو جلد پیش کی اس پر 26 دسمبر 1989 کی تاریخ درج ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کتاب پر جو تاریخ اشاعت درج ہے، وہ بازار میں اس سے بعد میں آئی ہو۔ یہ شاذ ہے کہ جو سنہ اشاعت چھپا ہے، کتاب اس سے پہلے سال میں شائع ہو چکی ہو۔ تدوین کے اعتبار سے فسانۂ عجائب کا انتخاب کرنا ایک ہفت خواں کا سامنا کرنا ہے۔ ایک تو اس کی مشکل زبان، پھر مختلف ایڈیشنوں میں مصنف کی ترمیم اور اضافے۔ رشید حسن خاں سے پہلے کئی محققوں نے اس کتاب کی ترتیب کی لیکن جب انھوں نے کی تو معلوم ہوا کہ اس کی تدوین کیسے کی جانی چاہیے تھی چند صفحات میں اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قاری خود اس کی ورق گردانی کر کے گل چینی کرے۔ اس کی ابتدا میں 114 صفحات کا مقدمہ ہے۔ پھر صحیح ترین متن، اس کے بعد تقریباً ڈھائی سو صفحوں پر حاشیے، فرہنگ اور اشاریہ۔ میں نہیں جانتا کہ مقدمہ، متن اور تعلقات میں کس حصے کو زیادہ عالمانہ قرار دوں۔ کتاب کا یہ عالم ہے:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

مقدمے کے ابتدائی حصے میں انھوں نے تدوین کی حدود متعین کی ہیں اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ لکھتے ہیں:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت صحیحِ متن کی ہوتی ہے۔'' (مقدمہ ص 22)

ان کے مطابق مصنف کی مفصل سوانح تشکیل کرنا، داستان کے ماخذ کی نشان دہی اور اس کا تنقیدی جائزہ تدوین متن میں داخل نہیں۔ سوانح یا مآخذ کو مختصر اً دیا جا سکتا ہے۔ مدون کو محض متعلقات متن پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

اس کے بعد انھوں نے سرور کی ''ولادت'' وطن، وفات اور مدفن'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ اطلاع دی کہ منشی نول کشور نے فسانۂ عجائب کا حق اشاعت خرید کر 1283 ہجری میں پہلا ایڈیشن شائع کیا لیکن اس سے پہلے بھی نول کشور اس کتاب کو شائع کر چکے تھے۔ 1283 ہجری کے ایڈیشن کو خاں صاحب نے برسوں کی تلاش کے بعد بہم پہنچایا (ص 27-26)۔ مخمور اکبر آبادی کے مرتبہ رام نرائن لعل ایڈیشن (1974) کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ بار دوم ہے، پہلی اشاعت 1928 کی ہوگی۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس یہ ایڈیشن زمانۂ طالب علمی سے ہے۔ ایم۔اے۔ کے کلاس میں بھی اسی سے متن خوانی کرتا تھا۔ فی الوقت میں نے یہ ایڈیشن اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس کو بجنور بھیج رکھا ہے۔

سرور کے وطن کے سلسلے میں بھی یہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے تین قدیم تذکروں میں کچھ اور ہی پایا۔ جتلا دعشق میرٹھی نے تذکرہ طبقاتِ سخن میں اور خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرے میں انھیں خوش باش شہر کالنہ پور لکھا ہے۔ خوب چند ذکا نے بھی معیار الشعرا میں انھیں ساکن کالنہ پور قرار دیا ہے۔ یہ بیانات اس وقت کے ہیں جب سرور نے فسانہ عجائب نہیں لکھی تھی۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر نیر مسعود اور رشید حسن خاں اپنی اپنی کتاب مرتب کرتے وقت ان تینوں کے مآخذ سے ناواقف تھے۔ حنیف نقوی کے مطابق سرور کے اہل خاندان کا مستقل قیام کانپور میں تھا۔ ان سب سے سرور کی لکھنؤ سے وطنی نسبت کے متعلق شبہے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن سرور صاحب نے فسانہ عجائب کی تمہید میں کانپور کی جس شدت کے ساتھ ہجو کی ہے اس کے پیش نظر یہ امکان نہیں رہتا کہ کانپور ان کا وطنِ مالوف ہوگا۔

قطعِ کلام کر کے مجھے ایک بات کہنی ہے۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب میں، نیز باغ و بہار میں فٹ نوٹ میں بہت سے اہم مطالب درج کیے ہیں جن کا متن مقدمہ سے براہ راست تعلق ہے۔ انھیں حاشیے میں کیوں جگہ دی گئی، متن میں کیوں نہیں۔ مثلاً زیرِ نظر کتاب کے ص 28 کے حاشیے 4 کو جس میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے سرور کو اکبر آبادی قرار دینے کا ذکر ہے۔ خاں صاحب کے ذہن میں حاشیے کے حصار کی بات صاف نہیں معلوم ہوتی۔

فٹ نوٹ میں عام سے مآخذ کا حوالہ دیا جاتا ہے یا ایسے تبصرے جو متن میں دیے جائیں تو مخل درمعقولات معلوم ہوں۔ حتی الامکان تبصراتی حاشیے متن ہی میں شامل کرنے چاہئیں۔ حواشی متن پر غالب نہ ہونے پائیں نہ اس کے حریف ہوں۔ حواشی کے مطالب کے صحیح حصار کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ’’تحقیق کا فن‘‘ (لکھنؤ 1990) ص 24-323۔

’’نوازش اور اصلاح‘‘ کے عنوان کے تحت فسانۂ عجائب میں سرور کے استاد نوازش کے اشعار کی بحث بڑے عارفانہ انداز میں کی ہے۔ فسانۂ عجائب کے صاحب فرمائش کے بارے میں یہ دریافت کہ وہ سرور کا مرد محبوب ہو سکتا ہے دلچسپ اور قابل قبول ہے۔ (ص 45)۔

لکھتے ہیں کہ قصے کہانیوں کی کتابوں میں نوطرز مرصع کو چھوڑ کر اور کوئی کتاب مشکل زبان میں نہیں لکھی گئی تھی (ص 55)۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حکیم مہجور کی گلشنِ نو بہار کے بھی بعض حصے حسب توفیق مرصع اسلوب میں لکھے گئے ہیں مثلاً:

’’او پرسخن وران شیریں مقال ونکتہ دانانِ صحیفۂ خیال کے حقیقت اس شکستہ حال، وابستۂ ملال ضیم الاعمال وخیم الخصال، آوارۂ بادیۂ کربت و سرگشتہ صحرائے غربت کے اخفا اور پوشیدہ نہ رہے۔‘‘

(گلشن نو بہار مرتبہ ڈاکٹر سلیمان حسین۔ لکھنؤ 1985 ص 84)

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور نے اسی کتاب کے اسلوب کی تقلید کی۔ خاں صاحب نے مقدمہ 61 سے 74 تک سرور کی زبان و بیان پر بحث کی ہے۔ متون کے مرتبین لسانیاتی مطالعے بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب کا ن ان کے عام اسلوب نگارش کے مطابق معلوماتی اور دلآویز دونوں ہے۔ اکثر اوقات کسی مصنف پر لکھنے والے اس کی مدلل مداحی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ رشید حسن خاں سرور کے طرف دار نہیں، اس کی تخلیق کے حسن و قبح دونوں کو بیان کرتے ہیں مثلاً:

’’فسانۂ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعایتوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اس میں ان کی ’کم مشقی‘ کا دخل کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔‘‘ (ص 65)

’’متعدد مقامات پر بیان میں ایسا بھدا پن ہے کہ اسے بے اختیار ’پھوہڑپن‘ کہنے کو جی چاہتا ہے۔‘‘ (ص 69)

انھوں نے اس کی جو مثالیں دی ہیں وہ ان جیسا خود اعتماد شخص ہی فراہم کرسکتا تھا۔ خاصے کے یہ بیانات ان کی تنقیدی نظر کی دین ہیں۔ انھوں نے ولسانی تجزیہ کیا ہے وہ روایتی تجزیے سے بہت مختلف اور مفید تر ہے۔

اس کے بعد انھوں نے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل دی ہیں۔ لکھتے ہیں:

’’اب تک اس کتاب کے کسی ایسے خطی نسخے کا پتا نہیں چل سکا جو مکمل کتاب پر حاوی ہو۔ عہدِ مصنف کا مکتوبہ ہو اور اس سے متن کی صحیح ترتیب میں مدد لی جا سکے۔‘‘ (ص 76)

’’فسانۂ عجائب‘‘ کی موجودہ ہیئت کا کوئی مخطوطہ نہیں لیکن محمود الٰہی والا بنیادی متن اور نورالحسن ہاشمی کا مملوکہ میر فضل رسول والا نسخہ دونوں مکمل کتاب پر حاوی ہیں۔ میں نے ان دونوں کے جزوی اختلافات پر ایک مفصل مضمون لکھ کر رسالہ ’’اردو‘‘ کراچی شمارہ 1، 1986، نیز ’’آج کل‘‘ بابت مئی 1986 میں شائع کرا دیا۔ بعد میں اسے اپنے مجموعۂ مضامین ’’کھوج‘‘ (دہلی 1990) میں شامل کرلیا۔ اس مضمون میں میں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محمود الٰہی کا نسخہ ہاشمی کے نسخے سے قدیم تر معلوم ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

’’پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرہ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ میرا اصل مقصد تو اس متن کی اس صورت کو پیش کرنا ہے جسے آخری بار مصنف نے پیش کیا تھا اور اس میں ان نسخوں کے مباحث کے شمول کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔‘‘ (ص 102)

خاں صاحب نے مطبوعہ نسخوں کے مخفف کے طور پر حرف علامات ح، م، ک وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔ ان سے مرتب کو سہولت ہو جاتی ہے لیکن قاری کی الجھن کا سامان ہو جاتا ہے۔ اسے یاد نہیں رہتا کہ کون سا حرف کس نسخے کی علامت ہے۔ اگر ان کے بجائے لفظی مخففات مثلاً حسنی 1 مصطفائی حیدری، حسنی 2۔ محمدی۔ افضل۔ نجم اور نول دغیرہ استعمال کرتے تو ذہن کو بھٹکنا نہ پڑتا۔ مقدمے کے آخری حصے میں علامات و رموز اوقاف کی تفصیل ہے۔ ان کے ذریعے سے انھوں نے صحت متن کی جو کوشش کی ہے وہ بے نظیر ہے مثلاً ذیل کی علامات دیکھیے:

یائے مخلوط کے لیے اس پر آٹھ کے ہندسے کا نشان مثلاً پیار۔ واوِ معدولہ کے نیچے خط مثلاً خوِ زادہ۔ درمیانِ لفظ واقع نونِ غنہ پر قوس کا الٹا نشان جیسے آنت۔

انھوں نے اسمائے معرفہ یعنی عَلَم کے اوپر خط کھینچا ہے۔ میری رائے میں قطعاً غیر ضروری ہے انگریزی میں کتابوں کے نام ترچھے حروفItalic میں چھاپے جاتے ہیں۔ مصنف اپنے مسودے میں کتاب کے نام کے نیچے خط کھینچ دیتا ہے جو پریس کے کمپوزیٹر کے لیے اشارہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کو ترچھے حروف میں چھاپا جائے۔ باقی اعلام کو خط کشیدہ نہیں کیا جاتا۔ خاں صاحب اپنی تحریروں میں اشخاص اور کتب کے ناموں کے اوپر خط کھینچتے ہیں۔ وضاحت کو اس کی ضرورت نہیں، ہاں بدنمائی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

انھوں نے اپنے مقدمے میں ایک اور نرالے رمز اوقاف بڑے بریکٹ [ ] کا استعمال کیا ہے۔ اردو اور انگریزی تحریر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انگریزی

نقرۂ معترضہ کو دو لمبی لکیروں کے بیچ محصور کر دیا جاتا ہے اور یہ قوسین کا نعم البدل ہیں۔ اردو میں اگر الٹے کاما سے اگر کام نہ چل سکے اور وضاحت کی غیر معمولی کوشش ہو تو چھوٹے بریکٹ یعنی قوسین ( ) کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ترتیبِ متن میں بڑا بریکٹ صرف وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں دوسرے کی عبارت کے بیچ چھوٹے ہوئے ایک آدھ لفظ کو خلا پُر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ بڑا بریکٹ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سے محصور الفاظ اصل متن میں موجود نہ تھے، مدوّن نے قیاساً لکھے ہیں۔ اس سے ہٹ کر عام تحریر میں بڑے بریکٹ کا استعمال خواہ مخواہ الجبرائی رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ چھوٹے بریکٹ کا استعمال بھی کم سے کم کرنا چاہیے۔

مجھے ان کی زبان کے محض دو الفاظ کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ انھوں نے جابجا مصرع مطبع وغیرہ کو امالے کی شکل میں مصرعے، مطبعے لکھا ہے۔ اپنی کتاب اردو املا میں ص43-441 پر ان الفاظ سے بحث کی ہے۔ بحرِ لکھنوی اور جلال ان الفاظ کو 'ے' بغیر لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ حرفِ ماقبل کو کسرے سے ادا کرنا امالے کے لیے کافی ہے جب کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی واحد محرف کی شکل میں بھی 'ے' کا اضافہ پسند کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں آخر الذکر کے مقلد ہیں۔ میری رائے میں بحر اور جلال کا موقف قابلِ ترجیح ہے۔

خاں صاحب کئی جگہ "ہے ہیٰ" کی جگہ "ہیٰ" کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً مقدمہ فسانہ عجائب میں ص52 سطر 6 میں، مقدمہ باغ و بہار میں ص63 سطر 19 میں۔ خاں صاحب کو میر امّن یا آغا حیدر حسن دہلوی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ داستان اور انشائیے میں یہ روپ جائز ہو سکتا ہے، علمی تحریر میں نہیں۔ مقدمے کا آخری عنوان "باعثِ تاخیر" ہے۔ خاں صاحب نے متن کی ترتیب اور اختلافِ نسخ کا کام مکمل کر لیا، متن کی کتابت بھی کرا لی کہ معلوم ہوا کہ پٹنے میں مصنف کا نظرِ ثانی کیا ہوا 1280 ہجری کا ایڈیشن ہے۔ اسے دیکھا۔ آسان صورت یہ تھی کہ کتابت شدہ متن کو اسی طرح رہنے دیا جاتا اور آخر میں ایک نوٹ شامل کر دیا جاتا کہ اس نسخے کی بازیافت اس منزل پر ہوئی کہ اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا لیکن خاں صاحب کا ضمیر اس پر تیار نہیں ہوا اور انھوں نے متن کو از سرِ نو مرتب کیا (ص112)۔ لکھتے ہیں:

"فسانۂ عجائب اور باغ و بہار دونوں میں مقدمے میں صفحات کے شمار کا ایک سلسلہ ہے، اس کے بعد متن میں نئے س 1 سے دوسرا سلسلہ جو کتاب کے آخر تک چلا جاتا ہے۔ اس طرح فسانہ عجائب میں ص1 سے 117 تک اور باغ و بہار میں ص1 سے 136 تک کے نمبر مکرّر ملتے ہیں۔ یہ دوہرا سلسلہ قواعدِ تدوین بلکہ روایتِ کتاب بندی کے بھی خلاف ہے۔ اب کبھی ان صفحات کا حوالہ دینا ہو تو لکھنا ہوگا مقدمہ صفحہ فلاں، متن صفحہ فلاں۔ اس دوئی کی وجہ لکھتے ہیں:

"ضمیموں کے اندراجات کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ متن پر نمبر شمار موجود ہوں (متن میں کتابت پہلے ہوئی تھی) تا کہ صفحات کا حوالہ دیا جا سکے۔ مقدمہ (حسبِ روایت اور حسبِ معمول) ضمیموں کی تکمیل کے بعد لکھا گیا۔ امتیاز کی خاطر ابتدائی حصے کے صفحات پر نمبر شمار صفحات کے نچلے حصے میں لکھے گئے ہیں جب کہ باقی کتاب میں صفحات کے نمبر شمار (حسبِ معمول) صفحات کے اوپری حصے پر ہیں (مقدمہ ص112)۔

"باغ و بہار" میں پوری کتاب میں نمبر شمار یکساں طور سے صفحے کے نچلے حصے ہی میں ہیں۔ میں مرتب اور کاتب کی مشکل کا اندازہ کر سکتا ہوں کہ اگر کتابت کا پورا کام مقدمہ لکھنے کے بعد شروع کیا جاتا تو اس میں جہاں جہاں دوسرے صفحوں کا حوالہ تھا (انگریزی میں اسے Cross Reference کہتے ہیں) وہاں خلا چھوڑا جاتا، پھر کتابت اور نمبر اندازی کے بعد ان خلاؤں کو پر کیا جاتا۔ بڑا دردِ سر ہوتا۔ دیوان غالب نسخۂ عرشی میں بھی مقدمے اور متن میں صفحوں کے نمبر کی یہی تکرار ہے۔

فسانہ عجائب کے متن کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ ہر فقرہ اور ترکیب قطعی طور پر منشائے مصنف کے مطابق ادا ہو جائے اس ایڈیشن کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ اسی کے لیے تو خاں صاحب نے اتنی کھکیڑ اٹھائی ہے۔ جب میں الٰہ آباد یونی ورسٹی کا ایم.اے. کا طالب علم تھا تو میرے اساتذہ پروفیسر ضامن علی اور سید اعجاز حسین کلاس میں کتابوں کے متن کو ہمیشہ کسی طالب علم سے پڑھواتے تھے اور جہاں کچھ بتانا ہوتا تھا وہاں طالب علم کو روک کر تبصرہ کر دیتے تھے۔ ایم.اے. کے دو برسوں میں قسم کھا کر ہر کلاس میں تنہا میں نے متن خوانی کی ہے۔ یہ بڑی ذمّے داری تھی اگر عطف و اضافت غلط آ جاتے تو مجھے نکو بننا پڑتا۔ میرے پاس فسانہ عجائب کا مخمور اکبر آبادی کا 1928 کا ایڈیشن تھا۔ کتاب بہت گنجان چھپی تھی۔ میں کلاس سے قبل ہوسٹل میں بیٹھ کر جملوں کے بیچ فقروں کو الگ کرنے کے لیے ان میں کاما اور ڈیش لگا کر کلاس میں جاتا تھا تا کہ میری جگ ہنسائی نہ ہو۔ اگر رشید حسن خاں کا مرتب کردہ متن میسر ہوتا تو کتنی سہولت ہوتی۔

اگر انھوں نے صحیح ترین متن پیش کیا ہے تو اس کے کاتب ابو جعفر زیدی اردو کے صحیح ترین خوش نویس ہیں جنھوں نے صحت زبان کی خاطر اپنی جان لڑا دی ہے۔ اس آقائے خطاطی نے کتابت کو تحقیق کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی دونوں کتابوں میں سہو کتابت کا سوال ہی نہیں۔

متن کے بعد سات ضمیمے ہیں: پہلا نثر ہائے خاتمہ کتاب، دوسرا تشریحات، تیسرا انتساب اشعار، چوتھا اشخاص، مقامات، عمارتیں، پانچواں تلفظ اور املا۔ چھٹا الفاظ اور طریق استعمال۔ یہ قاضی عبدالودود کے مطالبے کی

مناسبت ہے۔ ساتواں، ضمیمہ اختلاف نسخ کا ہے۔ یہ اختلافات صرف دیباچۂ فسانہ عجائب تک محدود ہیں۔ مدوّن نے 85 صفحوں کا ضمیمہ تیار کیا لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ زیادہ ضخامت کی وجہ سے یہ کتاب نہیں چھپ سکتی۔ ناچار اس ضمیمے کو حذف کرنا پڑا۔ افسوس۔ کتاب کی تکمیل میں ایک نقصان رہ گیا۔ اب انھیں چاہیے کہ اس اختلاف نسخ کو کسی رسالے میں یا علاحدہ کتابچے کے طور پر شائع کر دیں۔

ضمیموں کے بعد فرہنگ ہے جس کے دوسرے حصے میں عربی فقروں اور عبارتوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد مختصر اشاریہ ہے جو محض متن داستان پر حاوی ہے۔ سیر حاصل اشاریے کو مقدمۂ مرتب اور ضمیموں کا بھی احاطہ کرنا چاہیے تھا لیکن پھر وہی ضخامت کے اضافے کا سوال ابھرتا۔ میرے لیے یہ ضمیمے اور فرہنگ معلومات کے ایسے ہشت گنج خسرو ہیں جن کے مشاہدے اور [illegible]اضے میں عمر بسر کی جا سکتی ہے۔

باغ و بہار:

تصنیفی اعتبار سے ''باغ و بہار'' ''فسانہ عجائب'' پر مقدم ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کی تدوین فسانۂ عجائب کے بعد کی۔ انھوں نے 1964 میں مکتبہ جامعہ کے معیاری سیریز کے لیے باغ و بہار مرتب کی تھی۔ تبھی سے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس کتاب کو مکمل طریقے سے مدوّن کیا جائے۔ ان کی انتھک کوششوں کا نتیجہ 1992 میں سامنے آیا۔ خوش قسمتی سے ''باغ و بہار'' کی طبع اوّل (1804) دستیاب ہے۔ گلکرسٹ نے جس صحتِ جزو اوقاف کے ساتھ چھپوایا تھا وہ اس کی تدوین کا پہلا قدم تھا، خاں صاحب کی کاوش اس سفر کا آخری قدم ہے۔ میں نے یہ ایڈیشن دسمبر 1945 میں انجمن ترقی اردو دہلی میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اس کی ایک کاپی انجمن ترقی اردو بک ڈپو، اردو بازار دہلی میں برائے فروخت دیکھی۔ میں جموں یونیورسٹی کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ دکان کے مالک مولانا زیادہ قیمت مانگ رہے تھے۔ سودا نہ پٹ سکا۔ اب افسوس کرتا ہوں کہ بڑی کوتاہی کی۔ مجھے اتنا روپیہ دے کر خود اپنے لیے خرید لینا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں وہ کاپی کس ذخیرے کا مقسوم ہوئی۔

باغ و بہار کی اشاعت اول سے پہلے اس کے متن کے 102 صفحے ہندی مینول (1802) میں شائع ہو چکے تھے۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ مینول تقریباً نایاب ہے۔ رشید حسن خاں نے برسوں کی جستجو کے بعد اس کا عکس حاصل کیا۔ اس کی دلچسپ روداد مقدمے کے ص18-16 پر دیکھیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی کے بارے میں یہ مزے کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

''قدوائی صاحب اچھے دوست ہیں، مخلص اور غم گسار ہیں لیکن پرانے شرفائے کرام کی طرح کاہلی اور بے پروائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ سونے میں سہاگا یہ کہ انھوں نے لندن میں جن صاحب سے عکس بھیجنے کی فرمائش کی تھی وہ صاحب ان لوازم تہذیب اشرافیہ میں موصوف کے شریک غالب نکلے۔''

(ص17)

معلوم ہوا کہ کاہلی اور بے پروائی اشراف کی تہذیب کا لازمہ ہیں۔ خاں صاحب نے قیاس کیا کہ گو ہندی مینول میں صرف 102 صفحے چھپے لیکن اس کتاب کی اس روایت کو مکمل صورت میں کہیں تو ہونا ہی چاہیے۔ لکھتے ہیں کہ لندن میں اس روایت اوّل کا مکمل خطی نسخہ دریافت ہو گیا اور اس کا عکس بھی مل گیا (ص18) لیکن صفحہ 69 پر وہ اس نسخے کی جو تفصیل دیتے ہیں اس کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نسخہ کم سواد تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ہندی مینول کی پریس کاپی نہیں۔

اس مقدمے میں بھی وہ تدوین کی حدود کا وہی تعین کرتے ہیں جو ''فسانہ عجائب'' کے مقدمے میں کیا تھا اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کیا جائے۔ میر امن نے دلی کی بول چال کا روزمرہ لکھا ہے جس میں بار ہا نا مانوس روپ آ گئے ہیں۔ پیشتر کے مرتبین نے انھیں سہو طباعت سمجھ کر بدل دیا لیکن رشید حسن خاں نے میر امن کے ہاتھ کی لکھی ''گنج خوبی'' دیکھی ہے۔ ہندی مینول کے مطبوعہ اوراق، بقیہ حصے پر مشتمل مخطوطہ، گلکرسٹ کا نظامِ اوقاف، ان سب کی مدد سے وہ میر امن کے سویدائے دل میں اتر گئے ہیں، ہر لفظ اور ہر محاورے کو اسی طرح لکھا ہے جو میر امن کا منشا رہا ہوگا۔

وہ میر امن کی سوانح کے غیر مستند بیانات کو رد کر کے مختصر لیکن باوثوق حالات کی بازتشکیل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی کی غلط بیانی کے سبب ممتاز حسین اور مرزا حامد بیگ نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں ان کی پوری داستان منکشف کرتے ہیں۔ مفتی صاحب جس مرتبے کے راوی تھے، حامد بیگ اسی درجے کے مرید ثابت ہوئے جو آنکھ بند کر کے بیعت کر لیتے ہیں۔

''باغ و بہار۔ آغاز و اختتام'' (ص44) ایک مفید عنوان ہے جس میں یہ معرکے کی دریافت ہے کہ گلکرسٹ نے میر امن سے ''چار درویش'' کی تالیف کی فرمائش ان کے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے سے پہلے ہی کر دی تھی اور میر امن نے اصلاً اس کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ''کتاب کا نام'' کے تحت خاں صاحب لکھتے ہیں کہ میر امن نے اصلاً اس کا نام ''چار درویش'' رکھا تھا، نظرِ ثانی کے بعد ''باغ و بہار'' سے موسوم کیا (ص51)۔

کیا میر شیر علی افسوس نے ''باغ و بہار'' کی نثر کی درستی میں کچھ مشورے دیے، اس سلسلے میں انھوں نے افسوس کی ''آرائش محفل'' کے خطی نسخے (مخزونہ کلکتہ) کے دیباچے سے صحیح صورت حال معلوم کی۔ مطبوعہ نسخے میں اشارہ ہے کہ تفصیلات خطی نسخے میں دی ہیں۔ افسوس کہ فورٹ ولیم کی کتابوں

کی زبان کی درستی میں جن اختلافات کا سامنا کرنا پڑا، دیباچے کے بین السطور سے ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے حاشیے میں اعتراف کیا ہے کہ انھیں اس خطی نسخے کے وجود کی اطلاع ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے تحقیقی مقالے سے ملی۔ مجھے توجہ دلانی ہے کہ خاں صاحب نے ہر جگہ دوسروں سے ممنونیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

''باغ و بہار'' کے خطی نسخوں کے سلسلے میں وہ ڈاکٹر ثریا حسین کے مطبوعہ مقالے'' گارسیں دتاسی اردو خدمات، علمی کارنامے'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ثریا حسین نے مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں'' باغ و بہار'' کا 1217 ہجری کا مخطوطہ دیکھا (ص68)۔ جب خاں صاحب نے دنیا بھر سے قدیم روایتوں کی تلاش کی تو اتنے اہم نسخے سے کیوں صرف نظر کیا۔ کوشش کر کے اس کا عکس حاصل کرنا چاہیے تھا۔ کیا معلوم یہ اس کتاب کی طبع اول کی پریس کاپی بخط مصنف تو نہیں۔ اس سے قطع نظر انھوں نے لندن کے مخطوطے، ہندی مینول کے اوراق اور'' باغ و بہار'' طبع اوّل کے اندراجات کا دیدہ ریزی سے تقابلی مطالعہ کیا اور ان کی روشنی میں نسخۂ لندن کا شجرۂ نسب متعین کرنے کی قابل داد کوشش کی۔

نسخوں اور ایڈیشنوں کے لیے حرفی مخففات مجھے یہاں بھی الجھاتے ہیں مثلاً'' باغ و بہار'' طبع اوّل کی علامت ک کیوں ہے۔ لفظی مخفف ہوتو اس کی موضوعی علامت سے کوئی ذہنی نسبت ہوسکتی ہے۔ ص83 پر'' اعراب''، علامت، رموز اوقاف'' کا عنوان بیش بہا معلومات رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گلکرسٹ نے املا پر ایک رسالہ لکھا تھا جواب دستیاب نہیں لیکن اس کا نچوڑ کئی کتابوں میں موجود ہے۔ اسے خاں صاحب نے پیش کر دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں گلکرسٹ نے اس معرکے کا کام کیا۔

چار درویش کا قدیم ترین فارسی مخطوطہ حبیب گنج کلکشن مسلم یونیورسٹی میں بالیقین موجود تھا۔ میں نے نثری داستانیں میں اس کا ترقیمہ نقل کیا ہے۔ میری اطلاع کے بعد کسی نے اسے غائب کر دیا۔ افسوس۔

''باغ و بہار کی نثر۔ اہمیت اور اجزائے ترکیبی'' اس عنوان کے تحت ص107 سے 128 تک باغ و بہار کی زبان و بیان کا تجزیہ کیا ہے۔ کوئی محض لسانیات داں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور عارف راز ہی کی ضرورت تھی۔

کتاب کے مستند متن کے بعد تین ضمیمے ہیں: پہلا ضمیمہ'' تشریحات، اختلاف نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات، عمارتیں'' ہے۔ دوسرا ضمیمہ'' تلفظ اور املا'' ہے۔ یہ دونوں ضمیمے ایسی کانیں ہیں جن میں فاضلانہ معلومات کے سونے کے ڈلے بھرے پڑے ہیں۔ ان سے استفادے کے لیے کئی برس کا عرصہ درکار ہے۔

تیسرا ضمیمہ'' الفاظ اور طریق استعمال'' ہے۔ اس کے بعد فرہنگ ہے۔ باغ و بہار کی فرہنگ کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ اس کے بعض ایڈیشنوں کے شروع یا آخر کے اوراق کا عکس دیا ہے۔ ص711 پر یہ صحیفۂ زرّیں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس میں مقدمے کے 136 صفحے جوڑیے تو پوری کتاب 847 صفحات بغل میں لیے ہے۔

ہدیۂ تحسین و تبریک:

اب تک اردو نثر میں بہترین تدوینات مولانا عرشی اور مالک رام و مختار الدین احمد کی تھیں۔ رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کو اس انداز سے مدوّن کیا ہے کہ یہ ایسے مکمل و مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی امید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے۔ ان میں سے ہر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ایک ایک سال کی مدت چاہیے کیوں کہ ان کے ضمیموں میں جو معلومات بھری پڑی ہیں انھیں پرکھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے عمرِ عزیز کا ایک موقر حصہ نذر کرنا ہوگا۔ میر کا شعر ہے:

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

ان کتابوں کا بھی یہی عالم ہے۔ کئی مغربی و مشرقی علما کلاسکی زبانوں کے متون کو مرتب کر کے شہرت دوام پا چکے ہیں۔ رشید حسن خاں کا کام کسی سے کم معیار کا نہیں۔ اگر وہ کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتے، یورپ و امریکہ کی سیر کیے ہوتے، عظیم الشان جلسوں میں صدر مملکت یا وزیر اعظم سے رسم اجرا کراتے تب ان کارناموں کو عظیم الشان قرار دیا جاتا۔ بہ صورت موجودہ ایسے شاہکاروں کا جو غلغلہ ہونا چاہیے، نہیں ہوا۔ حضرت امیر حمزہ نے'' طلسم ہوش ربا'' فتح کیا تھا۔ تدوین کے ہفت خواں میں رشید حسن خاں کی تسخیر اس سے کم نہیں۔ اگر تدوین کوئی ملت ہوتی تو یہ کتابیں اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا مدوّن ان کا نبی، لیکن میں انھیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا گو اس پر کتنے زعما چیں بہ جبیں ہوں۔ مجھے رشید حسن خاں سے محبت نہیں (کدبھی نہیں)۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' انھیں پیش کی تو انھوں نے لکھا کہ میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں لکھا۔ شاید کتاب کی ورق گردانی کی ہی نہیں لیکن میں کیا کروں، میں تو فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کے مرتب کی قدر شناسی کے لیے مجبور ہوں۔ میں کہا کرتا تھا کہ اردو میں دانشوری کی روایت کمزور ہے۔ رشید حسن خاں کے دونوں کارناموں نیز ان کی کتاب'' زبان اور قواعد'' کے ہوتے یہ داغ رفع ہو جاتا ہے۔

□□□

تنویر احمد علوی

رشید حسن خاں — ایک منفرد محقق

پچھلی ربع صدی کے دوران ادبی تحقیق اور تحقیقی انتقادیات کے سلسلے میں چند اہم نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام بہ وجوہ بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

رشید حسن خاں نے اگرچہ بعض اہم تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن بیشتر انھوں نے اپنے مختص علمی میلانات کے زیر اثر قلم اٹھایا ہے اور اپنے تحقیقی مطالعے کے لیے کچھ مخصوص موضوعات کو منتخب کر لیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علمی نقطۂ نظر اور طریق عیارگری کے مطابق کسی دوسرے درجے پر آ کر لکھنا نہیں چاہتے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے کم لکھا ہے۔

اردو املا رشید حسن خاں کے یہاں تحقیق و تجسیس کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ بہت دقیع ہے۔ جو مسائل و مباحث گذشتہ ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں سامنے آئے ہیں، رشید حسن خاں نے ان کا مطالعہ گہری نظر اور غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ کیا ہے۔

اردو املا کی طرح زبان و قواعد کے مسائل بھی رشید حسن خاں کے لیے خصوصی توجہ اور علمی تحقیق و تجسیس کے مستحق رہے ہیں۔ اردو کی صفوں میں ایسے قابل استناد افراد اب کم ہوتے جا رہے ہیں جو ان مسائل سے پوری واقفیت اور کماحقہٗ دل چسپی رکھتے ہوں اور ان پر اظہار خیال کے بجا طور پر اہل ہوں۔ رشید حسن خاں نے ان پیچیدہ اور سلسلہ در سلسلہ مسائل پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور خلاصۂ بحث کے طور پر اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اردو زبان میں لفظوں کی تراش خراش اور صورت گری کے عمل کی کسوٹی ’’رواج عام‘‘ ہے اور اسی کو سند و برہان ماننا چاہیے۔

اس ضمن میں ان کے یہاں جو اہتمام تلاش جزئیات ملتا ہے، وہ زبان و قواعد کے مطالعے میں ان کی غیر معمولی تحقیق و تجسس کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔

رشید حسن خاں کا خاص موضوع ادبی تحقیق ہے۔ اپنی کتاب ’’ادبی تحقیق‘‘ میں انھوں نے اپنے تحقیقی مطالعے کے فکری نتائج اور ان سے استنباط کردہ اصول و نظریات کو پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں کے مضامین کا مجموعہ جو کتابی شکل میں سامنے آیا ہے، اردو زبان کی تحقیق و ادبیات میں بلاشبہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اسی کتاب میں وہ مضامین موجود ہیں جنھوں نے ہمیں ’’چونکایا‘‘ ہے اور اس کا بار بار احساس دلایا ہے کہ تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو بلکہ گفتگوؤں میں بار بار اس پر زور دیا ہے کہ تحقیق، تنقید سے الگ ہے اور تنقیدی تعبیرات سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ بات وہ غیر مبہم اور واشگاف لہجے میں اس لیے کہنا چاہتے ہیں کہ آج کل دانش گاہوں میں ’’ریسرچ‘‘ کے نام پر ہر طرح کی ادبی کارگزاریوں کو ’’تحقیق‘‘ کے دائرے میں داخل کر لیا گیا ہے اور جس نوعیت کا کام اس عنوان سے کیا جا رہا ہے، وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے اور اس سے خلطِ مبحث کے لیے بڑی گنجائشیں پیدا ہو گئی ہیں۔

تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

’’ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطور واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصول تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہوں۔

واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعے سے کام لیا جا رہا ہے۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بہ تدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آیندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی لیکن محض آیندہ امکانات پر ان باتوں کو بطور واقعہ نہیں مانا جا سکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔‘‘

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ ص9)

اس ایک گونہ تفصیلی اظہار رائے کے ساتھ آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے یہ بحث ایک نئے موضوع فکر و نظر سے جا ملتی ہے اور وہ یہ کہ تحقیق کو صرف واضح شہادت اور استخراجی نتائج تک محدود سمجھنا چاہیے۔ استقرائی سطح پر اخذ نتائج اور استنباط، اس سے الگ ’’دید و دریافت‘‘ کا ایک عمل ہے جس کے دائرے میں تنقیدی فکر و فہم اور تعبیرات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ رشید حسن خاں نے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا اور تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل

ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر دو مختلف افراد دو مختلف رائیں رکھ سکتے ہیں جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف کی گنجائش نہیں۔''

رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر میں جو قطعیت ہے، اس کا تعلق تحقیق کی اس تعریف سے ہے جس میں واقعہ اور واقعیت کا تعین ان بدیہی شواہد اور استخراجی نتائج کے تحت کیا جاتا ہے جس کے بارے میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس سے آگے اور الگ جو طریق رسائی موجود ہے اور جن وسائل تفہیم کا سہارا لیا جاتا ہے ان کو غیر علمی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان پر تحقیق اور تحقیقی طریق رسائی کا اطلاق بھی ممکن نہیں۔

اپنے نقطۂ نظر کی منطقی حدود میں زور دینے کے باوصف رشید حسن خاں کی نظر سے یہ نکتہ چھپا نہیں ہے کہ سادہ تحقیق کو خواہ اس کی بنیاد کتنے ہی منجمد اور ٹھوس حقائق پر ہو، اس وقت تک پر معنی اور نتیجہ خیز نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ دوسرے حقائق اور مضمر سچائیوں سے اس کی معنویت کا رشتہ نہ قائم ہو جائے۔ ادبی صداقتوں کے ضمن میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ رشید حسن خاں جہاں اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کو کرنا چاہیے، وہاں انھوں نے اس سچائی کو بھی بغیر کسی تذبذب فی الرائے کے پیش کر دیا ہے کہ:

''تحقیق میں اعداد و شمار اور مطلق حقائق کا تعین بنیادی چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے، بے حد ضروری لیکن اہم کام یہ بھی ہے کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے، دیکھا جائے کہ ان سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور ان سے علم و آگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔''

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ ص 103)

ظاہر ہے کہ علمی حقائق کے ''استنادی تعین'' اور بازیافت کے ''مبنی بر حقائق'' عمل کے بغیر اگر معنی آفرینی اور قیاس آرائی کی جائے گی تو وہ تعبیرات کا آرٹ تو ضرور ہوگا لیکن اس نوع کی رسائی فکر اور ذہنی اختراع کو ''سندِ اعتبار'' سے محروم تصور کیا جائے گا۔ اس لیے رشید حسن خاں کا یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:

''اب سے پہلے اس بات کا یقین دلانا مشکل تھا کہ تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد، اس سے نکالے ہوئے نتائج اور اس سے متعین کیے ہوئے حقائق کو سامنے رکھنا تنقید نگار کے لیے لازم ہوگا اور اس کے بغیر کچھ کہا جائے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کرے گی اور ناقد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان کو ملحوظ رکھے۔''

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ ص 100)

تنقیدی فکر و فہم اگر علمی طریق رسائی اور حقائق و شواہد کے صحیح تعین سے دور نہ جا پڑے تو وہ بھی نکتہ رسی، حقیقت شناسی و معنی بینی کا ایک بڑا وسیلہ ہے مگر اس کے وہی فیصلے درخورِ اعتنا اور قابل اعتبار ہوں گے جو استخراجی نتائج پر مبنی ہوں۔ محض استقرائی مفروضات کا کرشمہ نہ ہوں۔

رشید حسن خاں اپنے فیصلوں میں کسی نوع کی لچک یا دو رنگی خارج از بحث خیال کرتے ہیں۔ وہ صرف اس رائے کو مانتے ہیں اور منوانا چاہتے ہیں جس کی استنادی حیثیت مسلّم ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ''ریسرچ'' اپنی حدود کا تعین کرے اور اس سے آگے نہ جائے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

''یہاں پر یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ معروضی حقائق یا شواہد کا تعین کر دیتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرتا تو یہ بھی بجائے خود اہم ہے۔ ایک دوسرا شخص جو استخراج نتائج کی زیادہ اچھی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا کر دوسرے رخ کی تکمیل کرے گا۔ کبھی کبھی صلاحیتوں کی کمی بیشی کا فرق بھی بعض ناتمامیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔''

اس روشن اور شفاف انداز نظر کی مزید صراحت اس بیان میں سامنے آئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ خود رشید حسن خاں کے یہاں تنقید اور تحقیق میں کوئی تضاد کا رشتہ نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو تعامل اور تکمیل کا رشتہ ہے۔ انھوں نے اس بحث میں آگے چل کر یہ کہا ہے:

''استخراج نتائج کی طرف توجہ زیادہ مبذول ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سماجی اور سیاسی واقعات کے اثرات کی نشان دہی کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سمجھا گیا کہ کسی مصنف کے ساتھ تنقیدی سطح پر انصاف کرنے کے لیے صرف اس کے ذاتی حالات سے واقفیت کافی نہیں، وہ جس زمانے میں تھا اور اس کے گرد و پیش جو حالات چھائے ہوئے تھے اور وہ حالات جن خاص اسباب کا نتیجہ تھے ان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے خالص تحقیقی انداز سے سارے واقعات کا بالکل صحیح صحیح تعین کیا جائے۔ پھر تحقیق کی روشنی میں خالص منطقی انداز سے نتائج نکالے جائیں۔''

تحقیقی انداز نظر کے ساتھ واقعات کا تعین جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اردو میں تحقیقی رسائل کا فقدان تو نہیں ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ ایسے بہت سے وسائل منتشر ہیں اور ان کی وضاحتی فہرستیں بھی بیشتر صورتوں میں دستیاب نہیں۔ نئے مآخذ اور نو دریافت وسائل تک رسائی بہت سے افراد کے لیے یوں بھی ایک کارِ مشکل ہے۔ خاص طور پر ان کے لیے جو راہ تحقیق میں اول اول قدم رکھتے ہیں، تن آسانی محنت سے اعراض اور ذہنی کاہلی کی بات الگ رہی۔ تحقیقی تربیت کے لیے رہنما کتابوں کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔

علاوہ بریں عام حالات میں جن مصادر تک پہنچنا ممکن ہے، صدق روایت اور صحت متن کے لحاظ سے ان پر بھی اعتماد مشکل ہے۔ جن مآخذ میں ادبی تحقیق میں بھروسا کیا جا سکتا ہے اور جنھیں بالعموم درجۂ استناد دیا جا رہا ہے،

وہ متنوع قلمی مآخذ بالخصوص تذکرے اور بیاضیں ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ بھی بہت سی صورتوں میں سند و برہان کے کام نہیں آسکتیں اور یہ مسئلہ خود رشید حسن خاں نے اٹھایا ہے۔

اصولیاتِ تحقیق کے سلسلے میں رشید حسن خاں کا ایک اہم کارنامہ (جسے فی الجملہ ان کی اولیات میں شمار کیا جانا چاہیے) تذکروں اور بیاضوں پر ان کی تحقیقی گفتگو ہے جس میں انھوں نے ان مآخذ کی استنادی حیثیت پر "شک" کا اظہار کیا۔ اور اس مسئلے کو پہلی بار اہلِ علم اور اربابِ تحقیق کے سامنے رکھا ہے۔

اپنے مقالۂ تحقیق سے متعلق بعض مسائل میں انھوں نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

"بیشتر مطبوعہ تذکروں کے متن پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر مطبوعہ تذکرے اس قدر غلط چھپے ہیں یا ان میں ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں کہ ان کا از سرِ نو مرتب کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں وہ تذکرے بھی شامل ہیں جن کو ایک زمانے میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا اور وہ بھی جو اس زمانے میں بعض معروف حضرات کے مقدموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہوگا کہ امکان کی حد تک تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔ بعض مطبوعہ تذکروں کے جو خطی نسخے اب ملے ہیں، ان میں ایسے اضافے ہیں جن سے مطبوعہ تذکرے خالی ہیں۔

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ ص 45)

تذکروں پر یہ گفتگو ان اعتراضات سے بہ مراتب مختلف ہے جو گارساں دتاسی سے لے کر تا زمانۂ حال کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں تذکروں کی روایتی خامیوں کا ذکر نہیں، ان کی استنادی حیثیت کے تعین کا سوال ہے، جو ذہن کو ایک نئی سمتِ سفر دیتا ہے۔

انھوں نے بیاضوں کے حوالوں کو بھی مشکوک حوالوں کے ذیل میں رکھا ہے اور ان پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پرانی بیاضوں کا اچھا خاصا ذخیرہ مختلف کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ ہے۔ بیاض مرتب کرنے کا کوئی مقررہ طریقہ نہیں تھا۔ کسی مجموعے یا کسی دوسری بیاض سے بھی کلام نقل کیا جا سکتا تھا اور مختلف لوگوں کی زبان سے سن کر بھی شاملِ بیاض کیا جا سکتا تھا۔ اس میں صحتِ انتساب کی حیثیت ثانوی ہوا کرتی تھی، اصل چیز ہوتی تھی ذاتی پسندیدگی۔ ایسے مجموعوں کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے مندرجات عمومی طور پر صحتِ متن اور صحتِ انتساب کے لحاظ سے تصدیق کے محتاج رہیں گے......

ایسی مجہول الاحوال بیاضوں سے استفادہ خاص طور پر احتیاط کا طلب گار رہے گا۔"

بات بالکل صحیح ہے۔ صحتِ روایت، صحتِ انتساب اور صحتِ متن کا مسئلہ تحقیقی نقطۂ نظر سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس بحث کو اگر پھیلایا جائے تو بیشتر قلمی مآخذ اس کے دائرے میں آ جائیں گے اور زیادہ صحیح طریقِ رسائی وہی ہوگا کہ معتبر، غیر معتبر اور مشکوک کا فیصلہ کرنے میں احتیاط برتی جائے جس کے لیے رشید حسن خاں نے کہا ہے:

"روزنامچوں اور بیاضوں کے اندراجات ہوں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع، ان کا مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیے، مگر بطورِ حوالہ ان کو قبول کرنے میں احتیاط اور زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔"

ایک اور اہم مسئلے پر رشید حسن خاں نے خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، وہ اساسی مآخذ کے تراجم ہیں جو بدرجۂ مجبوری اساسی مآخذ کے ذیل میں آتے ہیں اور جن سے متعدد مواقع پر استفادہ ایک ناگزیر صورت ہوتا ہے:

"اردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کو جن مآخذ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، ان میں بیشتر فارسی میں ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کتابوں خاص طور پر تذکروں کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب بہت صاف اور واضح ہے کہ ترجمے کو اصل مآخذ کی حیثیت سے نہ پیش کیا جا سکتا ہے نہ کیا جانا چاہیے۔"

ظاہر ہے اس معاملے میں اصولی حیثیت سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن اس سلسلے کی فنی دشواریاں ایسی بھی نہیں جنھیں ناقابلِ التفات قرار دیا جائے۔

رشید حسن خاں کے یہاں جو تحقیقی اندازِ نظر ملتا ہے وہ کافی دنوں سے احتساب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یوں بھی اردو میں تحقیقی روایت نمایاں حیثیت سے "دو اہم مکاتبِ فکر" میں منقسم نظر آتی ہے، ایک روایت ہے جس کے تحقیقی کارناموں کی امتیازی شکل میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر گیان چند جیسے محققین کے ممتاز کارناموں میں ملتی ہے۔ یہ حضرات کسی دوسرے کام میں اعتراض یا احتساب کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے جب تک مقطع میں سخن گسترانہ بات نہ آ پڑے۔ ان کا مطمحِ نظر اپنے ذاتی کاموں میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے اور بس۔

دوسری روایت جو اس کے مقابلے میں آئی ہے، تحقیقی انتقاد کی وہ صورت ہے جس میں علمی کاموں کے تحقیقی جائزے اور "احتساب" کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ تاکہ غلطیوں کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے اور تحقیقی کام کرنے والے اپنی علمی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کریں۔ پروفیسر شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے اکابرین اسی دوسری روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا تعلق بھی اسی روایت سے ہے۔ وہ بھی علمی احتساب اور تحقیقی عیار گیری کو ایک ناگزیر تقاضا خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ صفائی اور زیادہ شدت کے ساتھ احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس پر عمل بھی کیا گیا...... اس لحاظ سے گویا تحقیق نے شیرانی صاحب کی

روایت کو پھر سے زندہ کیا جنھوں نے سب سے پہلے تحقیق کی سچائی کو ساری وضع داریوں، مروّتوں، مصلحتوں اور سخن گسترانہ اسالیب سے الگ رکھنے کی کوشش پر زور دیا تھا۔ اس زمانے میں قاضی عبدالودود نے اس کو پھر سے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ زندگی نو بخشی۔’’

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ ص 7-106)

اس سے رشید حسن خاں کا تحقیقی مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس کو اپناتے ہوئے ساری وضع داریوں، مروتوں اور مصلحتوں سے اپنے ناقدانہ رویے کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی سب سے بہتر مثالیں ان تحقیقی تبصروں میں سامنے آتی ہیں جو ‘‘علی گڑھ تاریخ ادب اردو’’ ‘‘دیوان غالب’’ مرتبہ مالک رام اور ‘‘تاریخ ادب اردو’’ مولفہ جمیل جالبی پر کیے گئے ہیں۔ ان تبصروں نے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا اور لکھنے والوں کو متنبہ کیا ہے اور تحقیقی نگارشوں میں احتیاط کے کیا معنی ہیں اس کی طرف بہت سے لوگوں کی نظر گئی ہے۔

تحقیق میں غلط فہمیوں اور غلط نگاریوں کی روک تھام ضروری ہے۔ اگر ہر طرح کے جذباتی رویوں اور غیر علمی فیصلوں کو برداشت کر لیا جائے تو راہ علم رفتہ رفتہ کانٹوں سے بھر جائے گی اور سہل نگاری عشق و عقیدت اور تنافر و تعصب کے تحت روایتی معلومات اور مزعومات کا انبار بڑھتا چلا جائے گا۔ جس طرح تنقید اچھے برے کی پرکھ اور ادب کی اقدار شناسی کے لیے ضروری ہے اسی طرح حقائق کی چھان بین کے لیے تحقیقی تجزیہ ایک ناگزیر صورت ہے جس کے بغیر معروضی سچائیوں کا تعین ممکن نہیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ‘‘زبان و قواعد’’ اور ‘‘اردو املا’’ جیسی کتابوں میں (جو یقیناً رشید حسن خاں کے وقیع علمی کارناموں میں سے ہیں) جو انداز نگارش ملتا ہے، اس کے مختارات بحث و تحریر میں شروع سے آخر تک وہی سنجیدہ اسلوب کارفرما ہے جس کی توقع وہ ایک محقق سے کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ میں ان کا رویہ نمایاں طور پر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا آغاز بگمان غالب علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر ان کے تاریخی تبصرے سے ہوتا ہے۔

تحقیق اور اخلاقیات تحقیق کے ضمن میں جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں، ان کی افادیت و اہمیت میں کلام کی گنجائش نہیں۔ ان مضامین کا اثر تحقیقی انداز پر مرتب کی جانے والی کتابوں سے بھی کچھ زیادہ ہوا ہے لیکن جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی انداز بیان کے سادہ سنجیدہ دائرے سے باہر آ گئی ہے۔ اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔ چبھتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ یاد رہ جاتے ہیں اور گرمی محفل کے کام آتے ہیں۔ یہاں ایسے بعض فقرے نقل کیے جاتے ہیں جو قوس و قزح کے نیم دائرے کی طرح زبان و بیان کے کچھ شوخ رنگوں کو تو واضح کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک محقق کی زبان کی سطح سے کچھ الگ بھی ہیں:

‘‘حالات کے زیر اثر تحقیق کو دانش گاہوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہے۔ جب کہیں پناہ گزینوں کا سیلاب آتا ہے تو شہری زندگی میں بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔’’

‘‘یہ ایسے عوامل ہیں کہ ان کا پھیلایا ہوا غبار زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھتا ہے۔’’

‘‘ایسے اداروں کا جو پنچایتی کام اب تک سامنے آیا ہے وہ معیار کے اعتبار سے مایوس کن ہے۔’’

‘‘اکثر سینیر اساتذہ کمیٹیوں کے ممبر بننے اور ترقی کے پیچ کرنے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کے فالتو کاموں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ (ان کا) طالب علم حیران و پریشان ادھر ادھر مدد کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔’’

‘‘ممتحنین کی طرف سے مقالے کے رد کیے جانے کا خطرہ یوں نہیں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر کون رکھ سکتا ہے۔’’

‘‘مشکل یہ ہوئی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتا چوں کہ ابھی ‘‘اوراق جمشیدی’’ کی مدد سے تو وہ اپنا ‘‘طلسم ہوش ربا’’ سجائے ہوئے ہے۔’’

‘‘علمی اور تحقیقی کارنامے اس طرح وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی۔’’

رشید حسن خاں کے یہاں اس نوع کے فقروں اور جملوں کی اہمیت اساسی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ ان کی زبان مجلسی اور صحافتی نہیں، وہ ایک محقق ہیں۔ اور ایک محقق کی طرح انداز بیان کی قطعیت کے قائل ہیں۔ وہ جس طرح مطالعہ میں ‘‘ارتکاز’’ کو ضروری خیال کرتے ہیں اسی طرح اپنی تحریروں میں بھی وہ ارتکاز پر زور دیتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں نظریاتی تنوع سے بھی اجتناب برتتے ہیں اور تنقیدی خیال آرائیوں سے بھی اب تقریباً دست کش ہو چکے ہیں۔

اردو زبان 47 کے بعد پچھلی ایک ثلث صدی میں جس ابتلائی دور سے گزری ہے اب وہ اس کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اس کے اثرات کو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس دور میں اردو تحقیق نے نمایاں حیثیت سے قدم آگے بڑھایا ہے۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے آداب اور اس کے ضابطوں کے بارے میں جو مضامین سپرد قلم کیے، ان میں معتبر، غیر معتبر اور مشکوک حوالوں کی بحث اٹھا کر اردو تحقیق میں ایک نئے فکر خیز باب کا اضافہ کیا ہے۔

□□□

رشید حسن خاں

کچھ اصولِ تحقیق کے بارے میں

حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ اس کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ: ’’تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے‘‘ (قاضی عبدالودود)۔ اس کے لیے یہ ماننا ہوگا کہ حقیقتِ واقعہ (یا اصلی شکل) بہ ذاتِ خود موجود ہوتی ہے، خواہ معلوم نہ ہو۔ اسی بنا پر یہ بات بھی ماننا ہوگی کہ ایسی رائیں جو تاویل اور تعبیر پر مبنی ہوں، واقعات کی مرادف نہیں ہوسکتیں؛ کیوں کہ وہ فی نفسہٖ کسی امر کی اصلی شکل نہیں ہوتیں۔ تعبیرات پر حقائق کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، یہی صورت قیاسات کی ہے۔

کسی امر کی اصلی شکل کا تعین اس وقت ہوگا جب اس کا علم ہو۔ یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کا معلوم نہ ہونا، اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا؛ لیکن ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بہ طورِ واقعہ اسی صورت میں متعین ہوگا جب اصولِ تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہو۔

واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا یا اہم اور غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعے سے کام لیا جا رہا ہے۔ جو بات ایک جگہ کم اہمیت رکھتی ہے، بہ خوبی ممکن ہے کہ دوسری جگہ زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔ تحقیق میں ہر واقعہ بجائے خود ایک حیثیت رکھتا ہے اور اس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کی جانی چاہیے۔ اُس معلومات سے کہاں، کس طرح اور کس قدر کام لیا جائے؛ یہ دوسری بات ہے اور اس کا تعلق ترتیب واقعات کے تقاضوں سے ہوگا۔ اس بات کو ایک اور طرح بھی کہا جا سکتا ہے: شاعرانہ مرتبے کے لحاظ سے سب شاعر یکساں حیثیت نہیں رکھتے، مثلاً آبرو اور ناجی بہ حیثیتِ غزل گو میر و درد کے ہم پلہ نہیں اور یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے؛ لیکن تاریخی ادوار کے لحاظ سے اپنے دور میں ان کی اہمیت ہے اور ارتقائے زبان کی بحث، قواعد زبان و بیان اور ترتیب لغت کے نقطۂ نظر سے آج ان شعرا کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ آبرو اور ناجی تو خیر اس دور کے معروف شاعر تھے، ان سے کچھ کم درجہ شعرا کے دواوین بھی آج لسانی مباحث کے لیے بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔

کسی امر کی اصلی شکل کی دریافت اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ صحیح صورت حال معلوم ہو سکے۔ اس سلسلے میں جو شہادتیں مہیا کی جائیں اور جو معلومات حاصل کی جائے، وہ ایسی ہونا چاہیے کہ استدلال کے کام آسکے، تاکہ واقعات کی ترتیب میں صحیح طور پر اس سے مدد ملے اور حدود تحقیق کے اندر نتائج نکالے جاسکیں۔ اس لیے یہ لازم ہوگا کہ جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے، وہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق، بہ ظاہر حالات شک سے بری ہوں اور جن مآخذ سے کام لیا جائے، وہ قابلِ اعتماد ہوں۔ غیر متعین، مشکوک اور قیاس پر مبنی خیالات کا مصرف جو بھی ہو؛ ان کی بنیاد پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نتائج نہیں نکالے جا سکتے۔ ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو سکے گی:

یہ بات سچ ہے کہ امیر خسرو نے ’’ہندوی‘‘ میں بھی شعر کہے ہیں، اس سلسلے میں ان کا اپنا بیان موجود ہے؛ لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ شعری سرمایہ کہاں ہے۔ خسرو کی جو مستند تصانیف ہمارے پاس ہیں، ان میں یہ ’’ہندوی کلام‘‘ موجود نہیں۔ معاصر تصانیف بھی ایسے کلام سے خالی ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ بہت سا کلام ان سے منسوب کیا جاتا ہے (دوہے، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ) مگر آج تک کسی شخص نے ایسی کوئی سند نہیں پیش کی ہے جس کی بنا پر اس کلام کا انتساب صحیح مانا جا سکے۔ جو حوالے دیے گئے ہیں، وہ اس قدر موخر ہیں کہ معتبر ماخذ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ سب سے قدیم حوالہ ایک دوہے کے سلسلے میں ’’سب رس‘‘ کا پیش کیا جاتا ہے، جو معروف دکنی تصنیف ہے۔ دیگر بحث طلب اُمور کے علاوہ، بڑی بات یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف اور امیر خسرو کے عہد میں کم و بیش تین سو سال کا زمانی فصل ہے اور درمیان کی کڑیاں غائب ہیں۔ میر کے تذکرے ’’نکات الشعرا‘‘ میں ایک قطعہ خسرو سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہاں بھی وہی صورت ہے کہ سیکڑوں برس پر مشتمل زمانی فصل موجود ہے۔ میر نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا نہیں اور خود ان کا تذکرہ خسرو کے سلسلے میں واحد ماخذ بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ محمد حسین آزاد نے مقدمہ آبِ حیات میں متعدد پہیلیاں (وغیرہ) خسرو سے منسوب کی ہیں اور حسب معمول حوالہ نہیں دیا، یہاں بھی وہی صورت ہے۔

غرض یہ کہ امیر خسرو کا ہندوی میں شعر کہنا مسلّم، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ذخیرہ کہاں ہے، اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ یہ اب تک کی معلومات کا حاصل ہے۔ جب تک اس سلسلے میں نئی معلومات حاصل نہ ہو، اس وقت تک یہی صورت حال برقرار رہے گی۔ اگر کوئی شخص نئے قابلِ قبول شواہد کے بغیر، روایت کے طور پر، خسرو سے منسوب ہندوی کلام کو پیش کرتا ہے تو اسے قبول

نہیں کیا جائے گا۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا، کیوں کہ ذرائع معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بالتدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ اس سے نئی معلومات کے امکانات کی نفی نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بات بھی اسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ محض آیندہ کے امکان کی بنا پر، ان باتوں کو بہ طور واقعہ نہیں مانا جا سکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔ جب بھی ایسی نئی معلومات حاصل ہوں گی جو اصولِ تحقیق کے مطابق قابلِ قبول ہو، تو اُسے لازماً قبول کر لیا جائے گا اور اس کے مطابق صورتِ حال کو تسلیم کر لیا جائے گا؛ خواہ وہ نئی معلومات پچھلے مسلمات کی تکذیب کرتی ہو یا ان کی مزید تصدیق کرتی ہو یا اس کی مدد سے اضافے ممکن ہوں۔ دریافت کا عمل اسی طرح جاری رہے گا اور ردّ و قبول کے احکام بھی اسی طرح کارفرما رہیں گے۔

تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابلِ اعتماد ہو۔ قابلِ اعتماد ہونا، مختلف حالات میں مختلف امور پر منحصر ہو سکتا ہے۔ اس کی قطعی حد بندی تو مشکل ہے، لیکن اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ بہ ظاہر حالات حوالہ مشکوک نہ معلوم ہوتا ہو اور دلیل منطق کے خلاف نہ ہو۔ روایت کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ راوی کون ہے۔ اس کے ساتھ اکثر صورتوں میں یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کن حالات میں روایت کی گئی تھی؛ خاص طور پر ان بیانات کے سلسلے میں جو کوئی شخص اپنے متعلق یا اپنے متعلقین و اسلاف کے متعلق دیا کرتا ہے (کیوں کہ ایسی صورتوں میں دانستہ یا نادانستہ غلط بیانی کا احتمال بہت کچھ رہا کرتا ہے)۔ مرزا غالب نے ہندوستانی فارسی دانوں پر جس طرح اعتراضات کیے تھے، اس کا ردِّ عمل ہونا ہی تھا اور پھر خود ان کے ہندوستانی ہونے اور بے استادے ہونے کی بحث بھی اٹھنا ہی تھی۔ جب انھوں نے ایک ‘‘جلیل القدر امیر زادۂ ایران’’ ہرمزد ثم عبدالصمد کے ہندوستان آنے اور ان کا مہمان بننے اور پھر ان کو فارسی کے اسرار و رموز سکھانے کا دعوا کیا تو قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہونا چاہیے تھا کہ یہ اچانک انکشاف کہیں ‘‘بے مرشدے ہونے’’ کے اُس اعتراض کا جواب تو نہیں! تحقیق کی نگاہیں آج تک اس ‘‘جلیل القدر امیر زادۂ ایران’’ سے آشنا نہیں(1) ہو سکی ہیں اور بہ ظاہر سارے حالات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ عبدالصمد غالب کا مخلوق ذہنی تھا، اس مشہور قول کے مطابق کہ: ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

یہ عین ممکن ہے کہ اچھے خاصے محتاط آدمی کو کسی خاص موضوع سے ایسا جذباتی تعلق ہو کہ وہ اس موضوع کی حد تک احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھ سکے۔ مثلاً پروفیسر سید مسعود حسن رضوی (مرحوم) احتیاط کے قائل تھے، محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا کرتے تھے؛ اس کے باوجود محمد حسین آزاد اور واجد علی شاہ کا ذکر آتے ہی وہ بہت جذباتی ہو جایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے سلسلے میں ان کی تحریروں کا بھی یہی احوال ہے۔ دیوانِ فائز کی ترتیب اور فائز کے حالات کی تحقیق میں انھوں نے جس احتیاط پسندی سے کام لیا ہے، (یہ بات اشاعت ثانی کو پیش نظر رکھ کر لکھی جا رہی ہے) آزاد اور واجد علی شاہ کے سلسلے میں اس طریق کار اور اس انداز نظر سے وہ کام نہیں لے سکے ہیں۔ اور میری رائے میں اس کی اصل وجہ جذباتی تعلق خاطر ہے۔ ان دونوں موضوعات کے سلسلے میں اگر مرحوم کی تحریروں سے استفادہ کیا جائے تو اس پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رہنا چاہیے۔

راوی کی شخصیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جن لوگوں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ واقعہ تراشی اور داستان سرائی سے بھی بلا تکلف کام لیا کرتے تھے، یا کوئی صاحب اس قدر خوش گمان اور زود یقین ہیں کہ تحقیق کی مشکل پسندی کے حریف نہیں ہو سکتے؛ تو ایسے مؤلفین اور راویوں کے فرمودات اور مختارات کو اس وقت تک بنائے استدلال نہیں بنایا جانا چاہیے جب تک کہ کسی معتبر ذریعے سے تصدیق نہ ہو جائے۔

بالواسطہ روایت پر انحصار اگر ضروری ہو تو بہت احتیاط کے ساتھ استفادہ کرنا چاہیے۔ اگر ماخذ قابلِ حصول ہو تو بہ راہِ راست استفادہ کرنا چاہیے اور اس کو لازم سمجھنا چاہیے۔ بالواسطہ استفادے سے آدمی بعض اوقات بے طرح مبتلائے غلط فہمی ہو جایا کرتا ہے۔ ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو سکے گی: یہ بات کہی گئی تھی کہ حیدر آباد کی آصفیہ لائبریری میں مطبوعہ دیوان غالب کا ایک ایسا نسخہ محفوظ ہے جس کی اغلاط کی تصحیح غالب نے اپنے قلم سے کی تھی۔ مالک رام صاحب نے جب دیوان غالب مرتب کرنا چاہا تو بجائے اس کے کہ خود اس نسخے کو دیکھتے اور فیصلہ کرتے (کیوں کہ اس سے بہ راہِ راست اور بہ آسانی استفادہ کیا جا سکتا تھا) یہ کیا کہ نصیر الدین ہاشمی (مرحوم) کو خط لکھا کہ: ‘‘یہ دیوانِ غالب اس لیے بھیج رہا ہوں کہ آپ کے وہاں جو نسخہ...... ہے اور جس پر خود غالب کے ہاتھ کی تصحیحات ہیں...... اسے دیکھ کر تمام اختلافات اس پر درج فرما دیں۔’’ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ آصفیہ لائبریری میں وہ نسخہ موجود نہیں۔ بالواسطہ اطلاعات پر بھروسا کیا گیا اور غلط فہمی کا بہت زیادہ سر و ساماں فراہم ہو گیا۔

یہ لکھا جا چکا ہے کہ تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا اور تحقیق کا مقصود

حقائق کی دریافت ہے؛ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت، تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر مختلف لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں، جب کہ تحقیق میں اختلافِ رائے کی اس طرح گنجائش نہیں۔ اس زمانے میں یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ تحقیقی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جائیں جو اصلاً تنقید کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ تحقیق اور تنقید دونوں کی حق تلفی ہے۔ تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا دائرۂ کار محدود ہوتا ہے۔ تحقیق، بنیادی حقائق کا تعین کرے گی اور ان کی مدد سے ایسے نتائج نکالے جا سکیں گے جن میں شک یا قیاس یا تاویل یا ذاتی رائے کا عمل دخل نہ ہو۔ اخذِ نتائج میں جہاں سے تعبیرات کی کارفرمائی شروع ہوگی اور ان پر مبنی اظہارِ رائے کا پھیلاو شروع ہوگا، وہاں تحقیق کی کارفرمائی ختم ہو جائے گی۔

زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا بھی غیر مناسب ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مختلف اثرات کے تحت حقائق کا صحیح طور پر علم نہیں ہو پائے گا۔ ذاتی اثرات، غیر معتبر روایتیں، گروہ بندی اور مذہبی یا سیاسی وابستگیوں کی پیدا کی ہوئی مصنوعی عقیدت؛ یہ ایسے عوامل ہیں کہ ان کا پھیلایا ہوا غبار زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھتا ہے۔ بالفرض سب کچھ معلوم ہو جائے، تب بھی ہندوستان کے موجودہ معاشرتی حالات میں بہ ظاہر اس کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ان سب حقائق اور ان کی تفصیلات کو بے کم و کاست پیش بھی کیا جا سکے گا۔ اس کے سوا، زندگی مجموعی طور پر ایک اکائی ہے اور یہ عمل و ردِ عمل کا طویل اور پیچیدہ سلسلہ ہے جو زندگی میں کسی ایک جگہ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی جب تک زندہ رہے گا، اس کا امکان ہے کہ وہ فکر و عمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہے اور ایسی تبدیلیوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ اسی لیے زندہ آدمی کے اعمال و افکار کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں اور مکمل تجزیے کے بغیر کسی شخص کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ زندہ آدمی کی شخصیت نقاب پوش رہتی ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ اس کو زندگی کے کسی شعبے میں خاص حیثیت حاصل ہو۔ موت آ کر سارے رکھ رکھاؤ کا خاتمہ کر دیا کرتی ہے، اس کے باوجود، حقائق کو پوری طرح بے نقاب ہونے کے لیے موت کے بعد بھی اچھا خاصا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے اور مناسب یہی ہوگا کہ مرحومین کے سلسلے میں بھی ایک خاص وقفے سے پہلے اس طرف توجہ نہ کی جائے۔ ایک بات اور: اب تک یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا تو اس انتخاب میں دنیاداری کی کسی مصلحت کو ضرور دخل تھا۔ بہ ظاہر حالات خیال یہ ہے کہ آیندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ عملی طور پر یہ بھی ایک انداز ستائش گری ہے (مستثنیات اگر ہیں تو ان سے بحث نہیں)۔

حافظہ جس طرح مدد کیا کرتا ہے، اُسی طرح دھوکا بھی دیا کرتا ہے۔ بارہا یہ ہوا ہے کہ یادداشت پر بھروسا کیا گیا اور کتاب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ صورتِ حال مختلف تھی۔ حافظے سے مدد لینا چاہیے، آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور کتاب دیکھے بغیر کسی بھی بات کو حوالۂ تحریر نہیں کرنا چاہیے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے آقائے پور داؤد کے حوالے سے لکھا ہے: ”قزوینی نے مرزبان نامہ کی ترتیب و تصحیح میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا، لیکن ان کا مرتبہ نسخہ ایران پہنچا تو بہت سی غلطیاں نکالی گئیں۔ قزوینی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے عہد کیا کہ سورۂ اخلاص کی آیت بھی آئندہ نقل کرنی ہوگی تو دیکھ لوں گا کہ قرآن میں کس طرح ہے۔ ظاہراً سب یا بیشتر اغلاط کا ذمے دار ان کا حافظہ تھا۔ انھوں نے اس پر اعتماد کیا اور اس نے دھوکا دیا۔“ (”آج کل“ اردو تحقیق نمبر 1967)۔

تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ اردو میں تنقید جس طرح انشا پردازی کا آرائش کدہ بن کر رہ گئی ہے، وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے: ”محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے ...... تناقض و تضاد اور ضعفِ استدلال سے بچنا چاہیے...... شبلی کی جو کتاب عالمگیر پر ہے اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے: ”فلسفۂ تاریخ کا ایک راز ہے کہ جو بات جتنی مشہور ہوتی ہے، اتنی ہی غلط ہوتی ہے۔“ یہ صریحاً غلط ہے اور شبلی یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ شہرت صحت کی ضامن نہیں۔“ (”آج کل“ اردو تحقیق نمبر)۔

---

(1) قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون ”غالب کا ایک فرضی استاد“ (علی گڑھ میگزین غالب نمبر) میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بھی ایک مضمون میں جو غالباً فاران (کراچی) کی کسی اشاعت میں شائع ہوا تھا، یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ مکاتیبِ غالب کے ایک حاشیے میں بھی یہی لکھا ہے: ”اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ”مجھ کو مبدۂ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ لوگ مجھ کو بے استادا کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔“

□□□

رشید حسن خاں

پہیلیوں سے متعلق چند باتیں

کچھ پرانی پہیلیوں کو عوامی ادب کا حصہ کہا جا سکتا ہے؛ مگر مناسب یہ ہوگا کہ پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ ''عوامی ادب'' سے مراد کیا ہے۔ ''لوک ادب'' سے متعلق اس مذاکرے میں بہ طورِ خاص صراحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ کبھی تو اس کو ''فوک لٹریچر'' کے مُرادف کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے اور کبھی لفظی معنوں کی رعایت سے بہت وسیع مفہوم میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے اور اس مفہوم کا دائرہ اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اس کی وسعت کے پیشِ نظر اس کی کوئی جامع تعریف شاید ہی کی جا سکے۔ میں ایک مثال سے اپنے مفہوم کو واضح کرنا چاہوں گا۔ نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر بھی کہا گیا ہے؛ یہ شمولیت بجائے خود درست ہو سکتی ہے، مگر اس صورت میں یہ بھی متعین ہو جائے گا کہ ''فوک لٹریچر'' اور ''عوامی ادب'' دو الگ الگ چیزیں ہیں، کیوں کہ نظیر کے کلام کو ''فوک لٹریچر'' ماننے کے لیے شاید ہی کوئی آمادہ ہو سکے۔

یہ خلطِ مبحث یوں پیدا ہوا ہے کہ اردو میں ''فوک لٹریچر'' کو اب سے پہلے کوئی قابلِ ذکر اور لائقِ توجہ چیز سمجھا ہی نہیں گیا، اس لیے فوک لٹریچر کا تصور ادبیات کا جز نہیں بن پایا، پھر اس کا مرادف کس طرح بنتا اور تعریف کیسے متعین ہوتی۔ ہاں ادب العالیہ (یا معیاری ادب) کے مقابلے میں ''عوامی ادب'' کی اصطلاح رواج پا سکتی تھی اور اس نے رواج پایا اور نظیر اکبر آبادی 1935 کے بعد عوامی شاعر قرار پائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ''فوک لٹریچر'' کا کوئی مرادف ہمارے پاس موجود نہیں۔ اس کا ہم معنی کوئی لفظ میرے ذہن میں بھی نہیں آتا، اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اس تحریر میں ''فوک لٹریچر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک مثال سے میرے مفہوم کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ شان الحق حقی صاحب نے اپنی بنائی ہوئی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کا ایک مجموعہ نذرِ خسرو کے نام سے 1983 میں شائع کیا تھا۔ ان نو مولود پہیلیوں کو فوک لٹریچر تو درکنار، عوامی ادب کا بھی حصہ نہیں مانا جا سکتا۔ ہاں ان کو ادب کا حصہ ضرور کہا جائے گا۔ یا جیسے انشا کے مجموعۂ کلام ''کلام انشا'' میں متعدد پہیلیاں بھی ہیں، مثال کے طور پر ''آہ'' کی یہ پہیلی:

ہے نصف تو اسمِ ذات کی سی صورت
دن کی صورت نہ رات کی سی صورت
کام آوے وہ درد میں، جو لکھیے انشا
تو ہو قلم و دوات کی سی صورت

(ص392)

یا جیسے بحر الفصاحت میں منیر شکوہ آبادی کے نام سے ''افیون'' کی یہ پہیلی لکھی ہوئی ہے:

مکر وہ طبعِ اہلِ خرد اُس کی کم سنی
پیری میں اس کی قدر جوانی سے بھی ہوا
ہے بے گناہ، پر یہ تعجب کی بات ہے
اُس کا ہی پوست کھینچتے ہیں اُس کے آشنا

(ص995)

نیز اسی قبیل کی اور سب پہیلیاں، یہ سب ادب کا حصہ ہیں، مگر انھیں فوک لٹریچر یا عوامی ادب میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات بھی ہماری نظر میں رہنا چاہیے کہ ''معمّا'' کی طرح ''پہیلی'' کو بھی علمِ بدیع کا ایک جُز مانا گیا ہے اور اسے صنائعِ لفظی میں شامل کیا گیا ہے (بحر الفصاحت)۔ اس طرح اصلاً عوامی ادب سے تعلق رکھنے والی ایک چیز، ایک منزل پر آ کر گویا غیر عوامی بن گئی۔ جن شاعروں کے دیوانوں میں دو چار پہیلیاں بھی شامل ہیں، تو ان کی وہی حیثیت ہے جو ''معمّا'' کی ہے۔ یعنی جس طرح مقررہ شرائط کی پابندی کے ساتھ ''معمّا'' بنائے گئے، اسی طرح رعایتِ لفظی کے مناسبات کے ساتھ پہیلیاں لکھی گئیں۔ اس طرح آخر میں آ کر ''معمّا'' کی طرح پہیلی بھی ایک ادبی چیز بن گئی؛ یوں ادبی پہیلیوں کا ایسا ذخیرہ بھی ہے جو عوامی ادب کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔

ایک مشکل اور ہے، میں نے جب بچپن میں پہیلیاں سنی تھیں تو اس وقت ان کی لفظیات میں یا بیان کے ڈھنگ میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا؛ مگر اب جب میں پہیلیوں کے ذخیرے پر نظر ڈالتا ہوں تو اس عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہوں کہ اکثر پہیلیوں میں عربی فارسی کے لفظوں کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے اور ایسی بہت سی اشیا بھی ان پہیلیوں کا موضوع ہوتی ہیں جو سراسر شہری زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دونوں بنیادی اجزا مجھے اس کے ماننے پر آمادہ نہیں کر پاتے کہ ایسی پہیلیاں فوک لٹریچر کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ ہاں جس وسیع معنی میں عوامی ادب کا لفظ استعمال کیا جا سکتا

ہے، اس کے دائرے میں یہ آسکتی ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ میں پہیلی کی تعریف یوں کی گئی ہے: ’’کسی قسم کا اَتا پتا، خواہ نظم میں خواہ نثر میں بتا کر اس چیز کا نام پوچھنا۔‘‘ اسی بات کو اس لغت کی پہلی جلد کے دیباچے میں، جہاں بہت سی پہیلیاں لکھی گئی ہیں، وضاحت کے ساتھ اس طرح لکھا گیا ہے: ’’پہیلی میں کسی چیز کے اوصاف و خصائص اور پتے بیان کرکے مخاطب سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس میں اتنے وصف ہیں۔ پہیلی میں یہ بڑی خوبی کہلاتی ہے کہ اُس چیز کا نام بھی آ جائے اور مخاطب نہ سمجھے۔‘‘ اس تعریف میں دو باتیں خاص طور پر ہمارے کام کی ہیں: ایک تو یہ کہ پہیلی نظم میں بھی ہوسکتی ہے اور نثر میں بھی؛ مگر یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ رسالوں اور کتابوں میں جو پہیلیاں لکھی ہوئی ملتی ہیں، ان میں زیادہ بلکہ بہت زیادہ تعداد منظوم پہیلیوں کی ہوتی ہے؛ لیکن یاد داشتوں میں جو پہیلیاں محفوظ ہیں ان میں قابلِ ذکر تعداد ایسی پہیلیوں کی بھی ملتی ہے جو یا تو واضح طور پر ایسے نثری ٹکڑے ہیں جن کو فقرے کہنا چاہیے، یا پھر ایسے ٹکڑوں کا مجموعہ ہیں جن میں قافیہ بندی کا انداز ہوتا ہے اور ایک خاص طرح کا آہنگ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ’’چاند‘‘ کی اس مشہور پہیلی کو دیکھیے: ’’خدا کا دیا سر پر‘‘ یا جیسے ’’توپ‘‘ کی یہ بہت مشہور پہیلی: ’’چھوٹا منہ بڑی بات‘‘ یہ دونوں نثری ٹکڑے ہیں یا جیسے ’’چارپائی‘‘ کی یہ پہیلی ’’چار کھڑے، چار پڑے؛ ایک ایک کے منہ میں دو دو بڑے۔‘‘

دوسری بات یہ ہے کہ پہیلی کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک تو وہ پہیلی جس میں کسی چیز کا اَتا پتا بتایا گیا ہو۔ زیادہ پہیلیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ دوسری قسم میں وہ پہیلیاں آتی ہیں جن میں اس چیز کا نام بھی آ جائے، مگر سننے والا فوری طور پر سمجھ نہ پائے؛ پتے نشان کی جو باتیں بتائی گئی ہوں، توجہ اُنھی پر لگی رہے۔ اسے اعلیٰ درجے کی پہیلی کہا گیا ہے۔ ایک مثال:

سر جالی، پیٹ سے خالی
پسلی ایک سے ایک نرالی
مجھ کو آوے یہی پرکھ
پیر نہ گردن، مونڈھا ایک

یہ ’’مونڈھے‘‘ کی پہیلی ہے اور آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ لفظ ’’مونڈھا‘‘ ایسے ڈھب سے آیا ہے کہ فوری طور پر ذہن اُس کی طرف مشکل ہی سے منتقل ہوسکتا ہے۔ پیٹ، پسلی، پیر، گردن: یہ چاروں ٹکڑے اسے بھی ایک عضوِ بدن کے طور پر اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں اسے صنعتِ ایہام کی اچھی مثال کہا جا سکتا ہے۔

اردو میں پہیلی کو ’’بجھارت‘‘ اور ’’بجھول‘‘ بھی کہتے ہیں (آصفیہ) مگر زیادہ مشہور اور مستعمل لفظ ’’پہیلی‘‘ ہے۔ فارسی میں اسے ’’چیستاں‘‘ اور ’’گرذک‘‘ کہتے ہیں، مگر مشہور اور مستعمل لفظ ’’چیستاں‘‘ ہے۔ یہ دراصل ’’چیست آں‘‘ تھا۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے ’’چیستاں‘‘ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ اکثر پہیلیاں ’’چیست آں‘‘ سے شروع ہوتی تھیں: ’’غالب لغزہا بہ چیست آں آغاز گردد‘‘ یہی ’’چیست آں‘‘ زبانوں پر چڑھ کر ’’چیستاں‘‘ بن گیا۔

دوسرا لفظ ’’گرذک‘‘ صاف ظاہر ہے کہ ’’گرد‘‘ سے بنا ہے، گول چیز، اسی نسبت سے گول گول بات مراد لی گئی ہے (’’گرذک: بالکسر دالِ مہملہ مفتوح، خیمہ و حجلہ، و چیستاں کہ آنرا پہیلی گویند۔ ونوعے از نان‘‘ (غیاث اللغات)۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں فارسی کی دو پہیلیاں بھی نمونے کے طور پر درج کر دی جائیں (یہ دونوں پہیلیاں آصفیہ میں بہ ذیلِ ’’چیستاں‘‘ مندرج ہیں):

یک خلقتِ کبوترانِ ابلق
ہستند جدا جدا معلّق
پرواز بہ آسماں نمایند
از خانۂ خود بروں نیایند

یہ آنکھوں کی پہیلی ہے۔ دوسری پہیلی ’’پاپڑ‘‘ کی ہے:

رنگش چو رنگِ زعفراں
بریاں چو جانِ عاشقاں
پادارد و پر ہم بداں
جاناں بگوایں چیستاں

(اس پہیلی کے تیسرے مصرعے میں نام موجود ہے: ’’پا‘‘ اور ’’پر‘‘ یعنی ’’پاپڑ‘‘۔ فارسی میں چوں کہ ڑے موجود نہیں، اس لیے جن لفظوں میں ڑے ہوتی ہے، انھیں رے کے ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے۔) عربی میں اسے ’’لغز‘‘ کہتے ہیں۔ (اس کا تلفظ تین طرح ملتا ہے: لَغز، لُغَز، لُغُز (المنجد)۔ بحر الفصاحت اور غیاث اللغات میں اسے صرف ایک طرح یعنی ’’لُغَز‘‘ لکھا گیا ہے اور اس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ مستعمل صورت یہی ہے)۔ غیاث اللغات میں ’’لُغَز‘‘ کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ صحرائی چوہے کے سوراخ کو ’’لُغَز‘‘ کہتے ہیں، جو بہت پیچ دار ہوتا ہے؛ اسی نسبت سے یہ کلامِ مبہم یعنی چیستاں کے معنی میں بھی مستعمل ہوگیا: ’’لغز: بہ ضمِ لام و فتحِ غینِ معجمہ و زای معجمہ، سوراخِ موشِ دشتی و آں بغایت پیچ دار باشد لہٰذا نامِ نوعے از کلامِ مبہم کہ بفارسی چیستاں گویند۔‘‘

پہیلی کے مرادفات اور اس کی تعریف کے بعد یہ ضروری ہے کہ ’’معمّا‘‘ اور ’’پہیلی‘‘ میں جو فرق ہے، اس کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ یہ اس

لیے بھی ضروری ہے کہ بعض معمے ایسے ہیں اور بعض پہیلیاں ایسی ہیں جن میں نازک سا فرق ہے اور اگر ان دونوں مستقل بالذات اصناف کی تعریف ذہن میں واضح نہیں ہوگی تو بہ آسانی اور بہ خوبی یہ ہو سکتا ہے کہ بعض معموں پر پہیلیوں کا گمان ہو، یا اس کے برعکس صورت پیدا ہو جائے۔

معما اپنی اصل کے لحاظ سے تو پہیلی ہی ہے، مگر اس نے ایک مستقل صنف کے لحاظ سے ترقی پائی، یہاں تک کہ اس کی حیثیت ایک فن کی ہو گئی۔ بعض لوگوں کے نام کے ساتھ لفظِ ''معمائی'' اسمِ نسبت کے طور پر شامل ہو گیا۔ یہ بہت پیچیدہ صنف ہے اور اس کے متعلق لمبی چوڑی بحثیں علمِ معانی و بیان کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ مختصراً اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ کسی لفظ کے اشارے یا کسی حرف کی دلالت کے واسطے سے کسی عبارت یا نام کو دریافت کرنا۔ معما میں بالعموم خاص نام مُراد ہوتے ہیں۔ یہ نام عموماً مذکور ہوتا ہے، مگر عبارت یا شعر میں یہ اس طرح چھپا ہوا ہوتا ہے کہ جب تک معما کے قواعد کا اچھا علم نہ ہو، ان بہت سے لفظوں میں سے اس خاص لفظ کو برآمد کرنا آسان نہیں ہوتا۔

معما اور پہیلی میں جو فرق ہے اسے صاحبِ بحر الفصاحت کے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ: مقصودِ اصلی معما میں حروف و الفاظ ہیں اور چیستاں میں مقصودِ اصلی اشیا کی ذاتیں ہیں'' (ص 994)۔ معما میں لفظِ مقصود کو حاصل کرنے کے جو بہت سے قواعد ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کسی لفظ کے پہلے حرف سے مراد ہو تو اس کی طرف مطلع، لب، فرق، رخ، سر، تاج (وغیرہ) الفاظ سے اشارہ کیا جائے گا۔ فسانۂ عجائب کی یہ عبارت اس کی مثال میں پیش کی گئی ہے:

''شہہ زادی نے کہا طبیعت کی جودت اس شخص کی مشہور ہے، ایک معما پوچھتی ہوں؛ بدیہہ اگر جواب دیا تو شک بے شک رفع ہوا۔ بھلا وہ کیا شے ہے جس کو گبر و مسلماں، یہود و نصارا، سب فرقہ انسان کا آشکارا کھاتا ہے؛ مگر جب سر کاٹ ڈالو تو زہر ہو جائے، کوئی نہ کھائے اور جو غصے میں کھائے تو فوراً مر جائے۔ جوان نے ہنس کے کہا کہ شہہ زادی! ''قسم'' ہے۔'' حرف قاف کو سر قرار دیا ہے۔''

(ایضاً ص 992)

یہ معما ہے، پہیلی نہیں؛ مگر پہیلی کی طرح کا معما ہے۔ چوں کہ اصلاً پہیلی اور معما دونوں ایک ہی چیز کے دو رُخ تھے، اس لیے بعض معمے، پہیلیوں جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں بعد میں معما نے الگ ایک صنعت کا انداز اختیار کر لیا اور عام طور پر خاص نام اس کا موضوع قرار پائے۔ کبھی تو بہت پیچیدگی کے ساتھ، جیسے مومن کے معمے، جو ان کے دیوانِ مطبوعہ میں موجود ہیں اور کبھی بہت سادہ، جیسے انشا کا کہا ہوا یہ معما جو بہ قولِ آزاد، جرأت سے متعلق ہے:

''سر مونڈی گھوڑی گجراتن'' یہاں وہی صورت ہے جو ''قسم'' اور ''سم'' میں ہے۔ ''یعنی'' ''سر'' اور پیر'' سے ''گجراتن'' کے پہلے حرف اور آخری حرف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ''سر'' اور ''پیر'' نکالنے کے بعد ''جرات'' باقی بچے گا۔

یہ دل چسپ بات ہے کہ بیشتر پہیلیوں میں کوئی نہ کوئی لفظی صنعت ضرور شامل ہوتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کئی صنعتیں ہوتی ہیں؛ مگر خاص بات یہ ہے کہ ساری لفظی رعایتیں کچھ اس طرح گھلی ملی ہوتی ہیں کہ بہ ظاہر یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایسا ہوگا۔ میں ایک دو مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ چاند کی مشہور پہیلی ہے: ''خدا کا دیا سر پر''۔ ''دیا'' میں صنعتِ ایہام ہے، کہ ''دیا'' ایک تو ''دینا'' مصدر کا فعل ہے اور دوسرے اسم ہے، چراغ کے معنی میں۔ اب پورے ٹکڑے کو لیجیے۔ ذرا سی توجہ کرنے سے یہ بات ذہن میں آ جائے گی کہ پورا ٹکڑا ایہام میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی اس کے ایک معنی تو یہ ہوں گے کہ خدا نے جو کچھ دیا ہے وہ سر آنکھوں پر، خوشی سے قبول ہے اور دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کا بنایا ہوا چراغ سب کے سروں پر جل رہا ہے۔

چراغ کی ایک بہت مشہور پہیلی ہے:

بالا ہو تو سب کو بھائے
اور بڑھے تو کام نہ آئے
لے دیا میں نے اس کا ناتو
بوجھ تو بوجھ، نہیں چھوڑ دے گا نو (1)

''بالا ہو'' کے دو معنی ہیں: روشن ہو اور کم سن ہو اور یوں اس میں ا ہے۔ اسی طرح ''بڑھے'' بھی ذو معنی ہے: ایک معنی تو یہ ہیں کہ گل ہو جائے اور دوسرے معنی ہیں بڑا ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے ''بالا ہو'' اور ''بڑھے'' میں تضاد ہے۔ ان کے علاوہ تیسرے مصرعے میں ''دیا'' آیا ہے، جو چراغ ہی کا ایک نام ہے اور اس طرح یہ ایک اور مناسبتِ لفظی ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ لفظ ''دیا'' اچھی پہیلی کی اس شرط کو بھی پورا کر رہا ہے جس کے مطابق پہیلی کے لفظوں میں اس چیز کا نام کسی ایسے طور سے آ جائے کہ بہ ظاہر معلوم نہ ہوتا ہو۔

میں نے اپنے بچپن میں بہت سی پہیلیاں سنی تھیں، ان میں سے اکثر اب یاد نہیں؛ مگر ایک بات ضرور یاد ہے کہ کئی بچے جمع ہوتے تھے اور کبھی یہ ہوتا تھا پہیلیاں بوجھی جاتی تھیں اور کبھی یہ ہوتا تھا کہ کوئی بڑا بوڑھا کوئی پہیلی کہتا تھا اور سب بچے اس کو بوجھنے میں لگ جاتے تھے۔ پہیلی مشکل ہوتی تھی تو نانی بی، دادی اماں یا بڑے بھائی صاحب اس کے متعلقات کو اس طرح بتانا شروع

کرتے تھے کہ ذہن کسی طرح ادھر منتقل ہو جائے۔ آپ اس پورے عمل پر آج ایک بار نظر ڈالیے تو آپ کو اب محسوس ہوگا ذہن میں براقی اور دڑاکی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔ بچوں کی کتابیں تو گویا ناپید تھیں۔ اس زمانے میں مکتب میں بغدادی قاعدہ یا پھر سیپارہ پڑھاتے تھے یا اردو کی پہلی دوسری کتاب اور بس۔ ان پہیلیوں کے واسطے سے بہت سی چیزوں کے ناموں کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی صفتیں اور ان کے متعلقات بھی ذہن میں بیٹھ جاتے تھے اور یہ پورا عمل کاوش، جستجو، تُک مِلانے، ذہن دوڑانے اور اندازہ لگانے کی ابتدائی صلاحیت پیدا کیا کرتا تھا۔

میں نے ابھی دو مثالوں کی مدد سے اس کی وضاحت کی ہے کہ پہیلی کی لفظیات میں باہم خاص نسبتیں بھی ہوتی ہیں، خاص کر لفظ کا ذو معنی ہونا (جس پر صنعتِ ایہام کی بنیاد ہوتی ہے)۔ یہ ذو معنی پن بھی بچوں کے ذہن میں روشنی پیدا کیا کرتا تھا، یعنی انھیں اس کا سادہ سا احساس ہونے لگتا تھا کہ ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہو سکتے ہیں۔

غرض کہ سوچنے، ڈھونڈنے، خیال دوڑانے اور صفات کی مدد سے یا اشاروں کے سہارے اشیا کا نقش اور عکس ذہن میں پیدا کرنے کا یہ ایک کامیاب وسیلہ تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ معلومات حاصل کرنے کا ایک اور پہلو بھی کچھ پہیلیوں میں پوشیدہ ہوتا تھا اور وہ تھا کسی خاص واقعے کا اس سے متعلق ہونا۔ ہم قواعد کی زبان میں کہیں گے کہ اُن پہیلیوں میں ''صنعتِ تلمیح'' ہوتی تھی۔ میں یہاں بھی ایک مثال سے بات کی وضاحت کروں گا۔ ایک پہیلی ہے:

بدھنا نے اک پُرکھ بنایا
تریادی اور بیہہ لگایا
چوک ہوئی کچھ واسے ایسی
دیس چھوڑ، ہوا پردیسی

مراد ہیں آدم و حوا۔ ایک پہیلی کے واسطے سے حضرت آدم کا قصہ معلومات کا جُز بن سکتا تھا۔ ایک اور بڑا فائدہ پہیلیوں کا یہ تھا کہ بالکل شروع میں، بچپن میں لفظیات کا شعور بھی بہت سی پہیلیوں کی مدد سے ذہن میں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر اِس پہیلی کو دیکھیے:

آدھی بوبو، ساری رانی ارتھ کرے سو بڑا گیانی

یہ بورانی کی پہیلی ہے۔ ''بوبو'' کا نصف ''بو'' لیا اور ''رانی'' کا لفظ پورا لیا، یوں ''بورانی'' بنا۔ لفظ شناسی اور لفظ سازی کا کچھ تو شعور ایسی پہیلیوں سے پیدا ہوتا ہوگا۔

چیستاں کے سلسلے میں فارسی شاعر لسّی کا شعر ہے:

اگر ایں چیستاں تو بکشائی
گوے دانش زموبداں ببری

مطلب اس سے یہی نکلتا ہے کہ پہیلی کو بوجھنے میں ذہانت جس طرح صرف ہوتی ہے، خیال جس طرح ہر طرف دوڑتا ہے، بہت سی چیزوں کے عکس جس طرح ذہن پر پڑتے ہیں، لفظوں کے نئے نئے رُخ جس طرح خیال میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں؛ یہ عمل بچے کی ذہانت کو مہمیز کرنے اور اس کی سادہ خیال آرائی پر صیقل کرنے کے مرادف ہوتا ہے۔

بچوں کی چھوٹی یا بڑی کہانیاں اور پہیلیاں، ان دونوں کے دائرے الگ الگ رہے ہیں۔ کہانی بڑی چیز تھی، اس کا دائرہ بھی وسیع تھا، معلومات کے لحاظ سے بھی اور تاثیر کے لحاظ سے بھی۔ پہیلی چھوٹی سی چیز تھی، مگر خیال کو جلا بخشنے میں اور ذہن میں جستجو اور دریافت کا عنصر پیدا کرنے میں اس کا حصہ کہانی سے بہت زیادہ رہا ہے۔ کہانی کی سادہ بیانی متاثر کرتی تھی، ذہن میں بعض سوال بھی پیدا کرتی ہوگی؛ مگر تفتیش و تفحص اور غور و فکر کے جو عناصر پہیلی سے پیدا ہو سکتے تھے، وہ کہانی کے دائرے سے باہر کی چیزیں تھیں۔ کہانیاں اکثر حیرت میں ڈال دیتی تھیں۔ معلومات حاصل کرنے کا جذبہ بس اسی قدر پیدا کر سکتی تھیں کہ اس کے بعد کیا ہوا! اور آخر میں یہ کہ بہت اچھا ہوا یا بہت برا ہوا۔ پہیلی کو اس اچھے یا برے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، وہ تو ذہن میں سوالیہ نشان پیدا کر دیا کرتی تھی اور حل کرنے کی صلاحیت کو جگایا کرتی تھی۔ یہ زیادہ بڑی صفت تھی۔

ایک مشکل یہ ہے کہ پہیلیوں کے جو مجموعے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں کبھی چھپے تھے، ایک تو وہ سب ملتے نہیں، اور جو ملتے ہیں ان میں غلطیاں حد سے زیادہ ہیں۔ مثلاً مجھے درگا پرشاد نادر کا مرتب کیا ہوا ایک رسالہ دکھایا گیا۔ 16 صفحے کا رسالہ اور ہر صفحے پر بہت سی پہیلیاں؛ مگر ان کا احوال یہ کہ کتابت کی غلطیوں نے اکثر پہیلیوں کی صورت مسخ کر دی ہے۔

پھر یہ کہ مشہور پہیلیوں کے متن میں بہت اختلافات ملتے ہیں: کچھ تو اس لیے کہ عام لوگوں سے تعلق رکھنے والی ایسی چیزوں میں لفظوں کا بدل جانا قدرتی بات ہے۔ اور کچھ اس لیے کہ مختلف زمانوں میں پہلے کے اجنبی لفظوں کو مانوس لفظوں سے بدل دیا گیا؛ مگر نقصان یہ ہوا کہ اس طرح بہت سی لفظی نسبتیں بگڑ گئیں۔

اس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پہیلیاں شروع سے مروج رہی ہیں، مگر ہم ان سب سے واقف نہیں۔ مثلاً جو شخص دہلی میں بیٹھا ہوا ہے، اسے نہیں معلوم کہ حیدرآباد میں یا میسور میں یا مدراس میں کون کون سی پہیلیاں مروج رہی ہیں۔ یا یہ کہ جو پہیلیاں مشترک ہیں، ان کی

لفظیات میں کیا فرق ہے۔ اس قدر مختلف علاقوں کی بہت سی پہیلیوں میں لفظیات کا اختلاف لازم ہے۔

موجودہ صورت میں پہیلیوں کا چھوٹا سا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، جو شمالی ہند کے بعض خاص علاقوں کا سرمایہ ہے۔ باقی وسیع سرمایہ جو ہے، اس سے ہم بے خبر ہیں۔ اس صورت میں صحیح طور پر نتائج نکالنا بہت مشکل ہے۔

کیا اچھا ہو کہ ہم پہیلی کو معمّا کی طرح ایک مستقل چیز مان لیں۔ یعنی اسے فوک لٹریچر اور عوامی ادب کے دائروں میں بند کرنے پر اصرار نہ کریں۔ اسی طرح صنائع لفظی کے دفتر سے اسے باہر نکال کر، ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت سے دیکھیں، اس کے متعلقات کو سمجھیں اور اس کے معنوی دائرے کی وسعت کو سامنے لائیں۔ ان میں لفظیات کی جو رنگارنگی ہے، مفاہیم کی جو اعجوبگی ہے، لفظی نسبتوں اور رعایتوں کی جو قابلِ توجہ کارفرمائی ہے: نئے پڑھنے والوں کے ذہن میں اُس کا عرفان پیدا کریں، تو یہ اچھا کام ہوگا۔ ایک ادبی صنف کی بازیافت تو بہر حال اسے کہا ہی جائے گا۔

آخر میں ایک بات اور بھی کہنے کی ہے۔ پہیلیاں آج کل بھی بنائی جا رہی ہیں، خاص کر بچوں کے رسالوں مثلاً ''اُمنگ'' اور ''پیامِ تعلیم'' میں یہ برابر دیکھنے میں آتی رہتی ہیں؛ لیکن بہت کم پہیلیاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں پرانے انداز کی پہیلیوں کے برابر رکھا جا سکے۔ ان نئی پہیلیوں میں ساختگی اور بناوٹ کا انداز بہت نمایاں ہوتا ہے۔ پرانی پہیلیوں میں جو بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے، اکثر نئی پہیلیاں ان سے خالی نظر آتی ہیں۔ اچھی پہیلیاں اب بھی وہی ہیں جو پہلے سے زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان نئی پہیلیوں میں ایسی پہیلیاں شاید ہی ہوں جو اس طرح زبانوں پر رواں ہو سکیں اور یادداشت کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ یہ پہلو بھی ہماری توجہ کا کچھ کم مستحق نہیں۔

---

(1) یہ پہیلی فرہنگ آصفیہ (مقدمۂ جلد اوّل) میں بھی ہے، وہاں اس کی صورت یہ ہے:

بالا تھا تو سب کو بھایا
بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
میں نے دیا اس کا نانو
بوجھ تو بوجھ نہیں چھوڑ دے گا نو

مگر میں نے اسے جناب شان الحق حقی کی کتاب نذرِ خسرو سے نقل کیا ہے۔ اس پہیلی کے متعلق حقی صاحب نے لکھا ہے کہ: ''میں نے بچپن میں اس طرح سنی تھی...... بعض نقل کرنے والوں نے ان نکتوں کو سمجھا ہی نہیں ورنہ ''بڑھے'' کی جگہ ''بڑا ہو'' کبھی نہ لکھتے کہ بات بے معنی ہو جاتی ہے۔'' میری رائے میں مرجح متن وہی ہے جس کے متعلق حقی صاحب نے لکھا ہے کہ ''میں نے بچپن میں اس طرح سنی تھی۔'' اسی لیے یہاں آصفیہ کے متن کو ترجیح نہیں دی گئی۔

□□□

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیادگزار قلی قطب شاہ فنونِ لطیفہ کا قدرشناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلّیات سیّدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مشتاق صدف
فیروز عالم

ساجدہ زیدی سے گفتگو

ساجدہ زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات سے بحیثیت صدر شعبہ سبک دوش ہوئیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی ایک معروف و منفرد شاعر، ڈراما نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور مترجم ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے "جوئے نغمہ، آتشِ سیّال، سیلِ وجود اور آتش زیرپا۔" دو ناول "موجِ ہوا پیچاں اور مٹی کے حرم" منظر عام پر آکر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ دو تنقیدی کتابیں، تلاشِ بصیرت اور گزر گاہ خیال کے علاوہ منظوم، ڈراما، سرحد کوئی نہیں اور، ڈراموں پر مبنی کتاب چاروں موسم، نے بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ پانچواں شعری مجموعہ۔ "پردہ ہے ساز کا" عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے۔ نفسیات و تعلیمات پر بھی ان کی چار عالمانہ کتابیں۔ شخصیت کے نظریات، انسانی شخصیت کے اسرار و رموز، Key Isues in Education اورChanging Perspectives on Creativity بے حد مقبول ہو کی ہیں۔نفسیات، تخلیق کی نفسیات، تعلیمات اور وجودی فلسفے میں ان کی خدمات کو ملک اور بیرونِ ملک شہرت و وقار ور مقبولیت حاصل ہوئی۔

ساجدہ زیدی 1927میں میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید محمد مستحسن زیدی (بار ایٹ لا) تھے اور والدہ مختار فاطمہ زیدی تھیں۔ ساجدہ زیدی کی شاعری کا ترجمہ انگریزی، روسی، مراٹھی، اڑیا اور ہندی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور اسپینی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اور ان کے تعارفی نوٹ تحریر کیے ہیں۔ اب تک درجنوں بیرونی ممالک کا دورہ کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے مختلف علمی و ادبی اور تعلیمی اداروں یو۔ جی۔ سی۔ اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ سے وابستہ رہی ہیں اور عمر کے اس پڑاؤ پر بھی بڑے انہماک سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔ ان کے ساتھ کی گئی گفتگو کے اقتباسات قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

سوال: جب آپ کوئی چیز تخلیق کرتی ہیں تو اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے؟ یا پھر کسی دباؤ میں لکھتی ہیں؟

جواب: محویت، انہماک، خود کو بھول جانے یا کھو دینے کی کیفیت، میرا رشتہ براہ راست اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ دباؤ میں تو نہیں لیکن فرمائش پر بھی کوئی چیز لکھتی ہوں (مثلاً کوئی مقالہ) تو نفسِ مضمون کو اپنا بنا کر، اس میں وقت تحریر محو ہو جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل دراصل ذات کے عمیق گوشوں تک رسائی سے عبارت ہے۔ میرا ذہن در حال تخلیق اسی کیفیت وجود میں گردش کرتا ہے۔ ہم ذات ہی کے شعور سے سماج اور کائنات تک پہنچ سکتے ہیں۔

سوال: آپ شاعری کی جانب کیسے راغب ہوئیں؟

جواب: ورثہ، ماحول، ذاتی تجربوں کی آنچ اور شاعری سے میرا وہ ذاتی رشتہ جو قضا و قدر نے مجھے بخشا تھا۔

سوال: کیا فنکار کی اہمیت کسی نظریے سے وابستگی کے سبب ممکن ہے؟

جواب: میرے خیال میں تو نہیں۔ لیکن ہمارے یہاں اردو میں تو یہی طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ فنکاروں کو نظریوں کی نسبت سے پہچانا اور پہچنوایا جاتا ہے۔ اردو میں اہمیت کا معاملہ فنکار کی تخلیقی سطح کے مقابلے میں، دیگر غیر ادبی خصوصیات کی نسبت سے طے کرنا فی زمانہ عام بات ہو گئی ہے۔

سوال: آپ کس ادبی فلسفے سے متاثر رہی ہیں۔

جواب: جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے مجھے مارکسزم اور وجودیت دونوں سے بے حد دلچسپی رہی ہے۔ مختصراً وجودیت فرد کی ذات کا فلسفہ ہے اور مارکسزم سماج میں فرد کے مقام کا۔ کوئی شاعر یا ادیب جو اپنی ذات سے منسلک ہے اپنے سماج اور کائنات سے بے تعلق کس طرح رہ سکتا ہے۔ میرے خیال میں فلسفے اور ادب کا ان سے سروکار ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ جیسا کہ اکثر ترقی پسند اور جدیدیت پرست

تقاضوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ یہ دونوں فلسفے اصلاً Complimentary ہیں۔ میری شاعری اور فکشن میں آپ دونوں ہی کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ باہم دیگر منسلک بھی اور خود آشکار بھی۔ لیکن اردو تنقید میں ان دونوں نظریات کو عموماً متضاد پیش کیا گیا، اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ دراصل تخلیق فلسفہ نہیں ہوتی۔ اولاً تخلیق ہوتی ہے۔ تخلیق کے کیف و کم تخیل اور عرفان کے دائرے میں ہوتے ہیں ہاں فلسفیانہ شعور اس میں گہرائی پیدا کر سکتا ہے۔

سوال: آپ کا نظریۂ فن کیا ہے؟

جواب: فن اور شاعری انسان کی ذات کی گہرائی کا اظہار ہے ذات کی پہنچ کا اظہار ہے۔ وجود و خیال کے وہ منطقے جہاں تک ہم عام زندگی کے کاروبار میں نہیں پہنچ سکتے۔ شاعری انسانی ذات اور کائنات کے رشتے کا اظہار ہے۔ انسانی کے نشاط و الم کی یکجائی کا اظہار ہے۔ یعنی شاعری انسان روح کے کرب کا اظہار ہے۔

سوال: نئی شاعری کس حد تک آپ کو متاثر کرتی ہے؟

جواب: اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں بھی ایسا ماحول تخلیق کیا گیا ہے، جس میں شاعر پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آ سکتا۔ اوّل تو نقاد تخلیق کا پیش رو بننے کا منصب اختیار کر گیا ہے۔ دوسرے آج کل نقادوں وغیرہ کا تمام تر زور غزل پر ہے۔ شاعری کا طرۂ امتیاز غزل ہی کو سمجھ لیا گیا ہے دراں حالیکہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا تقاضا ہے کہ شعری اظہار کے نئے اور وسیع تر امکانات۔ مثلاً نظمِ آزاد اور نظمِ معرّا کی کھل کر پذیرائی کی جائے کہ آج کے دور کی پیچیدگی اور تنوع کی ترجمانی ممکن ہو سکے۔ اور اس کے تسلسل میں نامانوس کیفیات و تجربات، نیز باریک تر رموزِ فن کی عقدہ کشائی ہو سکے۔ دوسری بات یہ کہ تنقید کو تخلیق کے پیچھے چلنا چاہیے۔ اور ہم عصر تنقید کی طرف سیاست اور مفادات سے بالاتر ہو کر رجوع کرنا چاہیے۔ بعض تنقیدی رویوں سے ادب کا بہت نقصان ہوا ہے مثلاً گروہ بندی اور ادبی سیاست اور سازشی ماحول وغیرہ۔

یوم الحساب

مجھے بے رحم ہستی کے زیاں خانے میں کیوں بھیجا گیا
کیوں حلقۂ زنجیر میں رکھ دی گئیں بے تابیاں میری

ہر اک منظر مری نظروں کا جویا تھا......
فروزاں شاخساروں پر ہجومِ رنگ و بو
اڑتا ہوا ابرِ رواں
سیماب پا موجیں
صبا کا رقص بے پروا
شب مہتاب کا افسوں
مہ و انجم کے رقصاں دائرے
روئے شفق
تاباں افق
دریاؤں کی رفتار
شب کے جاگتے اسرار
صحرا کا متور سینۂ عریاں
بڑا فیاض تھا فطرت کا کاشانہ......
طلسمِ بیکراں کے خواب گوں سائے
مری راتوں میں مثلِ برق لہرائے

کئی صحرا مرے گامِ تمنا کے شناسا تھے
وہ حرف و صوت کی وادی
وہ ذوقِ شعر کا جادہ......
وہ دامن کا ہر اک خارِ مغیلاں سے الجھنا
ہر طرف شورِ صدائے زندگی سننا
وہ عرفاں کے گریزاں آستانوں پر جبیں سائی
وہ دانش کی پذیرائی
وہ ہر ذرے میں دھڑکی کی صدا سننا
وہ ہر قطرے کے آئینے میں
نورِ حسنِ مطلق کا لرزنا
دل، نظر، حرف و ہنر کا ایک ہو جانا

سوال: آپ کا تعلق کس شعبۂ نفسیات سے رہا ہے اور کیوں؟

جواب: نفسیات کے بھی بہت سے دبستان ہیں، علمی اعتبار سے تو ان میں سے اکثر کا مطالعہ بھی رہا اور تدریس بھی کی مثلاً۔ فرائڈ کا تجزیۂ لاشعور اور ینگ کا تصورِ اجتماعی لاشعور اور "پرسونا اور شیڈو" (Persona and Shadow) وغیرہ کا تجزیہ۔ یہ سب "نفسیاتِ عمق" (Depth Psychology) کے دائرے میں آتے ہیں۔ نیو فرائڈیز (New Freudians) مثلاً ایرک فردم، کیرن ہورنی، ایڈلر رولوے وغیرہ نے نفسیاتِ عمق کو سماجی نفسیات سے جوڑنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ جس سے مثلاً ایرک فردم اور رولوے تصورات میں انسانیتی نفسیات Humanistle Psychology کا عکس بھی شامل ہو گیا۔ بہرحال یہ سوال تو بہت بڑا ہے۔ میرے خیال میں انسانی زندگی کی بنیاد اور مختلف مراحل کو سمجھنے کے لیے نفسیاتِ عمق، نیو

فرائڈ نیز اور انسانیتی نفسیات کا رول تجربی نفسیات یعنی Experimental Psychology سے زیادہ اہم اور معنی خیز ہے۔ ادب میں بھی نفسیات کے ان ہی اسکولوں کا اثر عام ہے۔ نفسیات سے لگاؤ کی وجہ مختصراً انسان سے لگاؤ، انسان کی فطرت، اس کی تقدیر اور اس کے نشاط والم سے لگاؤ سمجھیے۔

سوال: نفسیات سے لگاؤ کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: نفسیات سے لگاؤ کی وجہ یہی سمجھیے کہ مجھے انسان کی ذات، اس کے تجربات، اس کے کیف وکم میں دلچسپی ہے۔ میں انسان کی شخصیت کے اسرار و رموز اور اس کی پیچیدگی نیز گہرائی کو سمجھنے کی جویا ہوں۔ اسی دلچسپی نے مجھ سے شخصیت کی نفسیات دو ضخیم کتابیں لکھوائیں جن کی تکمیل میں مجھے کم و بیش دس بارہ سال لگے ہوں گے۔ یہ کتابیں نہ محض تحقیق ہیں نہ تخیل بلکہ دونوں کا امتزاج ہیں۔

سوال: ہندوستان میں موجودہ شاعری کی صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: شاعری ہندو پاک دونوں جگہ ہو رہی ہے۔ تعین قدر کرنا قبل از وقت ہے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ میرے خیال میں معمولی سے لے کر بہت اچھی شاعری تک ہو رہی ہے لیکن اس کی پرکھ مناسب طرح نہیں ہوئی ہے۔

سوال: آپ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے کن ادیبوں سے متاثر ہیں؟

جواب: بہت سے ادیب ہیں کس کس کا نام لوں۔ مختصراً عرض ہے۔ تالستائی، دستیووسکی، چیخف، شیکسپئر، برنارڈ شا، ہارڈی، ڈکنس، روماں رولاں، گورکی، ابسن، پرانڈیلو، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ایٹس، کافکا، کامیو، آبلی، پنٹر، سارتر غرض بہت سے روسی انگریزی فرانسیسی، ہسپانوی اطالوی ڈرامہ نگار اور ادیب ہیں۔ مجموعی طور پر مجھے مغربی ادب، مغربی مصوری و سنگتراشی بہت پسند ہے۔ فارسی ادب بالخصوص حافظ و سعدی ان فنکاروں کے علاوہ میرے ادبی محبوب ہیں۔ دیکھیے شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس بحرِ ذخار سے جو چند قطرے حاصل کیے ہیں سب ہی سرمایۂ ذہن و دل ہیں۔ اس مختصر گفتگو میں اس سوال کا کلی طور پر جواب دینا ممکن نہیں۔ میرے اگلے شعری مجموعے ''پردہ ہے ساز کا'' کے پیش لفظ میں کچھ معروضات شامل ہیں۔

سوال: آپ اردو کے کن شعرا سے متاثر ہیں؟

جواب: متاثر تو میں اپنے کئی کلاسکی شعرا سے ہوں۔ غالب میرے گرو ہیں۔ اقبال میرے ذہنی ہمسفر ہیں۔ میر بعض مقامات پر تار رگِ جاں کو چھیڑتے ہیں۔ انیس زبان کے استاد ہیں اور روحانی و اخلاقی نظامِ اقدار کا منبع ہیں۔ حالی۔ میرے جدامجد ہی نہیں بلکہ بعض انسانی اوصاف کا سرچشمہ بھی ہیں۔ ان کی کسر نفسی اور Modesty تخلیق کاروں میں عنقا ہے اور ان کا Comittment بے مثال۔ ان کی شاعرانہ (خصوصاً غزلیہ شاعری کی) سادگی دلپذیر ہے۔ پھر ہمارے پیش رو ہیں۔ فیض، سردار جعفری۔ ن م راشد اور اختر الایمان ہیں۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ متاثر سے یہ مطلب نہ لیجیے گا کہ میں نے ان سب کا اثر تخلیق شعر میں قبول کیا ہے۔ میرا مطلب پسندیدگی اور محبت و احترام سے ہے۔ اثر تو انسانی ذہن پر اس کے گذشتہ شعر و فن اور ثقافت کی تمامتر وراثت کا ہوتا ہے۔ مبہم، مسلسل اور ناقابلِ تجزیہ...... لیکن جہاں تک اپنی شاعری میں کسی سے اثر قبول کرنے کا سوال ہے۔ میں نے نہیں کیا۔ کم از کم شعوری طور پر۔ میری شاعری میرے اپنے ذہن و دل کی طلب اور روح کے کرب کا

تکلم، جستجو، رفتار و غم کا مدعا پانا
کوئی عیسیٰ نفس دیتا تھا نام زیست نذرانہ
لرزتا التجاپ آگہی سے تھا مری نظروں کا پیانہ

گریزاں ساعتوں کے کارواں کو کس نے پکڑا ہے......
نظر محو تألِ دوش وفردا ہے
کئی دیوار و سقف و سائباں کے منجمد چہرے
کئی اونچی چٹانیں راہ میں حائل
کئی تیروں سے میری خیمہ گاہِ آرزو چھلنی
کئی ترکش ہوئے اس جسم پر خالی
ہوئی جاتی ہے رزمِ زندگانی مضمحل گھائل،

تو......
نشاط و درد کی وہ خوشہ چینی چھوڑ دی ہم نے
عنانِ بزمِ امکاں توڑ دی ہم نے

سکوتِ شام ہے بجھنے لگے سارے چراغ بزم آرائی
مجھے شاید......
ہمالہ کی فلک پیمائیاں آواز دیتی ہیں
میں اپنی موت سے
ان برف زاروں کی درخشندہ معیت میں ملوں گی
توڑ دوں گی حلقۂ زنجیر محرومی

اظہار ہے یہ قضا و قدر کا وہ عطیہ ہے جسے سر جھکا کر قبول کرنے کے علاوہ چارۂ کار نہیں تھا۔

سوال: آپ کی بہن زاہدہ زیدی بھی مقبول و معروف شاعرہ ہیں۔ ان کا مقابلہ آپ سے کیا جائے تو کسے زیادہ بہتر کہنا مناسب ہوگا۔ آپ خود بتائیے؟

جواب: ہم بہنوں کا آپس میں مقابلہ کرنے کا کوئی جواز مجھے نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں کا اگر مقابلہ ہے تو ہم عصر اور قریبی پیش رووں سے ہے۔ لیکن تنقید و تفہیم شعر میں مقابلے سے زیادہ اہم، ہر شاعر کو اس کے مخصوص محاورے اور سروکار سے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش ہے۔

سوال: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ خود کو اخترالایمان کی سطح کی شاعر سمجھتی ہیں؟

جواب: میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔ اشارۃً بھی نہیں۔ میں اخترالایمان کو بحیثیت شاعر بہت پسند کرتی ہوں، ان کا احترام کرتی ہوں۔ ان پر دو مقالات لکھ چکی ہوں۔ (خود ان کی فرمائش پر لیکن افسوس کہ ان کی وفات کے بعد) اخترالایمان کی اور میری شاعری کا مخصوص محاورے اور اسلوب بالکل جدا گانہ ہے۔ بشرط فرصت و صحت بھی ہو ان کی شاعری پر اور بھی لکھوں گی...... جن لوگوں کا یہ کہنا ہے۔ یا اعتراض ہے (ہوسکتا ہے خود آپ کا ہی ہو) کہیں ان کے ذہن میں تو یہ خیال نہیں آیا؟ خود ستائی نہیں کروں گی لیکن زمانہ بتائے گا کہ میری نصف سے زائد نظمیں ''اپنے دور کے'' بڑے سے بڑے شاعر سے ٹکر لے سکتی ہیں۔ (اگرچہ میرا اسلوب ان سب سے جدا ہے) عظیم شاعر تو اقبال کے بعد کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ویسے شاعر کو اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ میری پیاس ابھی باقی ہے۔

وہی اذانِ حق کا سلسلہ ہے

مگر یہ گوشۂ تنہائی اپنا رازداں تو ہے
اسے معلوم ہے ہم وقت کے لمبے سفر میں مسکرانا، گنگنانا بھول آئے ہیں
سکوتِ شب میں......
دل کی آگ سے طوفاں اٹھانا بھول آئے ہیں

ہماری روح میں
روزِ ازل کی جو طلسمی مسکراہٹ تھی،
ہمارے قلب میں
جو سرخوشی کی نرم آہٹ تھی،
ہمارے دل میں
جو درد و نشاط و کیف کے چشمے ابلتے تھے،
ہمارے غم میں
جو آتش فروزاں تھی،
ہماری شامِ تنہائی میں
آہِ نارسا کی لو جو لرزاں تھی
ہماری صبحِ خاموشی میں
جو کلمہ کلام و محویت کی روح جولاں تھی
ہماری بزمِ باطن میں
تمناؤں کا جو رقصِ مسلسل تھا
ہمارے سوزِ ہجراں میں
جو اک سرخ و سنہری رنگ
سازِ نوا و شعر میں جو نغمہ و اذان کا آہنگ تھا......
غرض اشجارِ ہستی میں جو برگ و بار آئے تھے
ہوا ایسی مخالف تھی
کہ پت جھڑ ہوتی رہتی تھی
ہماری چشمِ حیراں
جو گذرگاہِ بصیرت تھی
ہماری آرزوئے دل جو رزمِ زندگانی کا فسانہ تھی
جو دردِ بیکراں کی بیکرانی کا ترانہ تھی......
ہماری روح کی
جو پیاس صحراؤں سی پھیلی تھی،
ہمارے عشق میں

سوال: آپ اپنی پسندیدہ نظموں کے نام بتائیے؟

جواب: اس وقت یاد کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی چند نام یاد آ رہے ہیں بتاتی ہوں۔ اذانِ سحر، صبح صادق، ''متاع آرزو کھو کر ملا کیا''۔ پل صراطِ تمنا، حکم سفر دیا تھا۔ جستجو ذات کی، یوم الحساب، شب چراغ زندگی تو سوالوں کی زنجیر ہے۔ یہ دنیائے وحدت، ہماری روح کا نغمہ کیا ہے، کب سے محوِ سفر ہو، کیا لکھوں کیا نہ لکھوں، آتشِ سیال، سیلِ وجود... اس وقت اتنے ہی نام ذہن میں آ رہے ہیں۔ بہت سی نظموں پر تو میں عنوان ہی نہیں دیتی۔ خصوصاً پہلے دو مجموعوں کی۔ بس ایک نظم لکھ دیتی ہوں مدعا یہ کہ بنیادی خیال تک قاری خود پہنچنے کی کوشش کرے تو بہتر ہے۔

سوال: آج کل نثری نظموں کا چلن عام ہو گیا ہے۔ کیا آپ اسے شاعری مانتی ہیں؟

جواب: نثری نظم شاعری نہیں ہو سکتی۔ ہر فن کے کچھ اصول کچھ لوازمات ہوتے ہیں جو ناگزیر ہیں مثلاً اردو شاعری میں فکر و تخیل، احساس و خیال کے علاوہ (جو ہر فن میں ہوتے ہیں) وزن'' بحر، نغمگی، آہنگ، روانی وغیرہ ناگزیر ہیں۔ علامت، استعارہ، رمز و کنایہ وغیرہ بھی شاعری کے وہ اجزا ہیں جو نظم کی طرح نثر میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے... شاعری اپیل کرتی ہے، مسحور کرتی ہے، اب تک میری نظر سے کوئی ایسی

''نثری نظم'' نہیں گزری جس نے بیساختہ اپیل کیا ہو۔ مسحور کرنا تو بڑی بات ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ہمارے عہد میں میر و غالب، اقبال، انیس کے مرتبے کا کوئی بڑا شاعر نہیں ہے جب کہ نثر میں قرۃالعین حیدر، عبداللہ حسین جیسے بڑے ادیب موجود ہیں۔

جواب: دیکھیے میر و غالب اقبال و انیس جیسے عظیم شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اپنے عہد کا کرب، اپنے زمانے کا اضطراب اور تاریخی شعور انھیں پیدا کرتا ہے مغلیہ عہد کے زوال کی عبرت خیز داستان اور اس کے روحانی کرب نے غالب جیسے نابغۂ روزگار کو پیدا کیا۔ اور امت مسلمہ کے زوال اور انتشار اور ان کے پراگندگی، فکر و خیال کے غم اور روحانی کرب نے اقبال کو اقبال بنایا آج کے مسائل پیچیدہ اور عالمگیر ہیں۔ ہم بے حس مادیت، صارفیت اشتہاروں امریکہ جیسی دہشت گرد قوت کی جارحیت، انسانی اقدار کی بہانگِ دہل تردید، خون ناحق، عراق اور افغانستان کی ہولناک تباہی کے عہد میں ہم نیپام بم، کے عہد میں جی رہے ہیں۔ ہم انسان (فرد واحد) کی اور قوموں کی بے چارگی، مفلوی اور کم مائیگی کے عہد میں، اور مٹھی بھر انسانیت کے دشمنوں کی سفاک ایٹمی سازشوں کے عہد میں جی رہے ہیں۔ ہمارے عہد کا کرب اتنا پیچیدہ ہے کہ اس میں شاعرانہ عظمت کا امکان بھی دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے عہد کا اضطراب اور ہے، ہمارا درد شعر کا سانچہ توڑ دیتا ہے۔ رہا قرۃالعین حیدر اور عبداللہ حسین جیسے بڑے نثر نگاروں کا سوال، تو ان کے لیول کے شاعر تو آئے ہیں اور آرہے ہیں وقت بتا دے گا۔

محبوب سے معبود تک جو سلسلہ سا تھا،
ہمارا دل
فراق جاوداں کا جو شنا سا تھا،
ہمارے اضطرابِ جاں میں
جو خاموش لرزش تھی،
جو وصل و ہجر و ایماں کی طلسمی وارداتیں تھیں،
جو تخلیق نواؤ صوت کے پیہم اشارے تھے
یہ سب کچھ...... اور وہ سب کچھ
جو روز آفرینش سے ہمارے تھے
(جو ربّ عز و جل کی رحمتوں نے ہم کو بخشے تھے)
وہ سب کچھ وقت کے لمبے سفر میں
لٹ گیا...... لوٹا گیا......
اب لمحہ و ساعت کا طولانی خلا ہے......
اور ہم ہیں
اک وجودِ نارسا کا کرب ہے......
راہِ عدم کا فاصلہ ہے......
اور ہم ہیں
ولیکن غیب سے اک دلنشیں آواز آئی ہے۔
زمیں سے آسماں تک......
بزمِ دل سے لامکاں تک......
اک ندائے کیف گونجی ہے......
''کہ تخلیقِ رواں کا کارواں ہے......
اور تم ہو
''وہی سرِّ خودی کا رازداں، سوزِ نہاں ہے
اور تم ہو''
''وہی موجِ ہوائے درد ہے
پرواز ہے، اور آسماں ہے
اور تم ہو''
''وہی اذانِ حق کا سلسلہ ہے
اور تم ہو......''

سوال: کیا وجہ ہے کہ یہ دور شاعری کا نہیں بلکہ نثر کا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب بھی اس سے پہلے والے جواب میں مضمر ہے۔ اس میں اپنے ملک میں بڑھتی ہوئی نا انصافیوں خصوصاً فرقہ وارانہ عصبیت اور اردو زبان کے خلاف جارحیت کو اور شامل کر لیجیے۔ اس منظر نامے کو ظاہر ہے نثر میں سمیٹنا ممکن ہے، نظم (شاعری) ایک روحانی عہد نامہ ہے، اس میں اتنی Sordid حالات کیسے سما سکتے ہیں۔ نظم کے اوزان علامت، استعارہ، کنایہ تخیل اور روحانی کیف و کم ہیں۔ اس کا رشتہ عرفان و وجدان سے ہے چنانچہ ساری دنیا ہی میں یہ دور نثر کا ہے... اس پر بھی اگر ہم جیسے کچھ دیوانے شاعری سے رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں، تو ان کے حوصلے کو سمجھیے ان کے درد کو سمجھیے۔ غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے شاعری میں میرا معاملہ تو بس یہی ہے:

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

□□□

اسد ثنائی

سکندر احمد سے گفتگو

معزز قارئین! اُردو فکشن کے سمجھ دار تنقید نگاروں کے اگر نام گنوائے جائیں تو شاید ایک ہاتھ کی پوری اُنگلیاں بھی زیادہ پڑجائیں۔ ہاں اگر ناسمجھ ناقدین کے نام لیے جائیں تو ہاتھوں اور پانوں، دونوں کی انگلیاں بھی کم پڑ جائیں گی۔ اس لیے یہاں ناقدین کے ناموں کو الگنی پر لٹکانے کے بجائے ایک متین، فطین اور تازہ دم نقاد سکندر احمد صاحب سے گذشتہ دنوں لیا گیا انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے جو فکشن کو اپنی پوری آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

اسد ثنائی: فکشن سے آپ کی کیا مراد ہے اور آپ فکشن کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں؟

سکندر احمد: دیکھیے جہاں تک فکشن کا تعلق ہے یہ انگریزی کا لفظ ہے اور اردو میں عام طور پر فکشن کا ترجمہ افسانہ کر دیا جاتا ہے جب کہ ایسا ہے نہیں۔ مغربی ادب میں جب فکشن کی بات ہوتی ہے تو عام طور پر ناول پر گفتگو ہوتی ہے۔ اردو میں جب بات آتی ہے تو عام طور پر سارا فوکس افسانوں پر چلا جاتا ہے۔ اب اردو کے حوالے سے آپ بات کریں گے تو فکشن سے مراد ناول بھی ہوسکتا ہے۔ فکشن سے مراد افسانے بھی ہو سکتے ہیں اور فکشن سے مراد داستانیں بھی ہوسکتی ہیں۔ پھر اگر داستانوں کو لیں تو اس میں مثنویاں بھی شامل ہوسکتی ہیں۔ مثنویاں بھی منظوم کہانیاں ہیں۔ لیکن آج کے تناظر میں ہم بات کریں گے تو بالعموم ناول اور افسانے اور بالخصوص افسانے ہی اس زمرے میں آئیں گے اردو کے حوالے سے۔ یہ تو ایک صنف کی بات ہوئی۔ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے اردو کے حوالے سے تو یہ ایک آزادانہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے مگر آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ مغرب میں آج بھی فکشن کو دوسرے درجے کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ویسے بھی اس مضمون میں جو حوالے ہیں وہ کچھ پرانے ہیں۔ میں آپ کو 2000 کا ایک حوالہ بتا رہا ہوں۔ ایک صاحب ہیں J. Hartman انھوں نے فکشن کی حمایت میں سن 2000 میں ایک مضمون لکھا تھا۔ مضمون کا نام تھا Brevity is the soul of fiction یعنی ''اختصار افسانے کی روح ہے۔'' یہ مضمون Strange Horizons میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں اس بات کا ذکر کیا کہ افسانوں کو یعنی Short Stories کو ادب میں وہ مقام نہیں ملا جو انھیں ملنا چاہیے تھا۔ اور انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ افسانے اپنے اختصار کی وجہ سے ناول پر فوقیت رکھتے ہیں اور انھوں نے بہت ساری خصوصیات گنوائیں۔ مثلاً اگر آپ ایک رسالہ نکال رہے ہیں تو آپ اگر اس میں ناول شائع کریں گے تو اس میں بہت سارے تجربات کی گنجائش نہیں رہے گی۔ لیکن آپ افسانے شائع کریں گے تو اس میں تجربات کی گنجائش بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے ہوسکتا ہے کہ دو چار افسانے لوگوں کو پسند نہ آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ دو چار افسانے لوگوں کو پسند بھی آ جائیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ 2000 تک میں بھی صنفی حیثیت سے افسانے کے لیے Argument کی ضرورت پڑی کہ افسانے (Short Stories) صنفی اعتبار سے ناول سے کچھ کم نہیں۔ یہ بات تو ہے مغرب کی لیکن اردو کے حوالے سے فکشن میں سب سے زیادہ مرکزیت افسانوں کو ہی حاصل ہے اور پھر جب بات اور آگے بڑھے گی تو ناولٹ تک بھی جائے گی۔

اسد ثنائی: بحیثیت مجموعی آپ افسانے اور ناول میں کیسے فرق کریں گے؟ کیا فکشن شاعری سے کمتر درجے کی صنف ہے؟

سکندر احمد: دیکھیے اگر آپ فکشن میں ناول کو لیں گے تو اس میں آپ کو فالتو باتیں کہنے کی بہت گنجائش ہوگی۔ مثلاً آپ کی ہماری گفتگو ہو رہی ہے اس میں اگر آپ کے حلیے کی بات کروں کہ آپ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں تو اس کا براہ راست گفتگو سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یعنی کہ اس میں فروعات کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ ایک بات تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فروعات کس طرح سے فکشن کی اصل میں ضم ہو جائیں۔ یہ ایک فن ہے جس سے بہت سارے افسانہ نگار واقف نہیں۔ جب کرشن چندر کشمیر کا حسن بیان کریں گے تو ''بالکنی'' میں بھی بیان کریں گے، ''شکست'' میں بھی اور

''طوفان کی کلیاں'' میں بھی۔ تو معلوم یہ ہوا کہ یکساں منظر کشی سارے افسانوں میں یا سارے ناولوں میں یا سارے فکشن میں Common ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ فکشن کی صنفی حیثیت بہت زیادہ بلند نہیں۔ خاص طور پر افسانوں کی۔ شعر کے مقابلے میں فکشن واقعات سے بندھا ہوا ہے۔ داخلی سطح پر کچھ ہو رہا ہے یا خارجی سطح پر کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ ہو رہا ہے یعنی کہ وقت گذر رہا ہے۔ یہ وقت سے بندھی ہوئی صنف ہے تو ظاہری بات ہے کہ شاعری میں جو آفاقیت ہے وہ فکشن میں نہیں سما سکتی کیوں کہ یہ زماں و مکاں دونوں سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں زماں و مکاں کی بات آئے گی تو بہت سارے فروعات کی گنجائش نکل آئے گی اور خواہ مخواہ آپ اسے جیسے چاہے کھینچ سکتے ہیں۔ اب اگر آپ کوئی ناول پڑھیں اور تین چار صفحے آپ چھوڑ بھی دیں تو بھی اصل سے سرا نہیں چھوٹتا اور شعر میں ایک ایک لفظ اہمیت رکھتا ہے۔ فکشن کی انتہا یہی ہے کہ شاعری بن جائے اور فکشن جب اپنی معراج کو پہنچ جائے گا تو یہ زماں و مکاں کی حدود سے آگے نکل جائے گا یعنی کہ ایک بیچ کی کڑی آپ ہٹائیں تو وہ گر جائے۔ شاعری کا درجہ فکشن سے بہت بلند ہے اور فکشن میں بھی ناول کا مقام افسانوں سے بلند ہے۔ ناول میں آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ ناول میں آپ ایک آفاقیت پیدا کر سکتے ہیں چونکہ ضخامت اور طوالت کے اعتبار سے آپ کو یہ موقع ملتا ہے لیکن افسانے میں یہ موقع نہیں ملتا اور وحدت تاثر کا مسئلہ بھی ہے کہ صاحب وحدت تاثر ٹوٹ گیا تو فکشن بکھر گیا۔ جیسے ایڈگر ایلن پو نے کہا کہ آپ اسے ایک نشست میں پڑھ لیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں جانا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات تو ہوئی جو تقابلی طور پر کہی جاسکتی ہے لیکن اپنے آپ میں آپ کسی بھی زبان کی اگر بات کریں گے تو Short Story کے بغیر اس کا ذکر مکمل نہیں ہوگا' شاعری سے کمتر سہی مگر افسانے کا مقام متعین اور مستحکم ہے۔

اسد ثنائی: کیا اردو میں فکشن کا متبادل لفظ نہیں ہے؟

سکندر احمد: اردو میں اس کا متبادل کوئی لفظ نہیں ہے۔ ہم آپ کو ایک بار اور بتا دیں۔ آپ عربی ادب کی تاریخ پڑھ جایئے ظاہری بات ہے ہمارا تعلق مشرقی ادب سے ہے اور اردو میں بھی عربی اور فارسی کے بغیر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ آپ عربی ادب کی پوری تاریخ پڑھ جایئے۔ میرے پاس John Hopkins یونیورسٹی کا تاریخ عربی ادب پر پورا مکالمہ ہے۔ پورے مکالمے میں ڈھونڈنے سے بھی کہیں عربی ادب میں فکشن کے متعلق کوئی بات نہیں ملتی۔ نثر کے حوالوں سے یا یوں کہیے نثری ادب کا تذکرہ ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ John Hopkins یونیورسٹی کا اپنا نظریہ ہوگا لیکن احمد زیادت کی ایک کتاب ہے عربی ادب پر جس کا پاکستان میں ترجمہ ہوا ہے اس کو شروع سے آخر تک پڑھ جایئے نثر کے حوالے سے، انشا پردازی پر خوب لکھا ہے۔ بیورو کریسی میں ان کے یہاں بنوامیہ میں، بنوعباس میں نوٹس جو لکھے جاتے تھے اور نوٹس پر جو حواشی لکھے جاتے تھے ان تک کا ذکر ہے اور ان کی نثری حیثیت کیا ہے یا گفتگو کے دوران کوئی کوئی جملہ کسی کے منہ سے نکل جائے اس تک کا ذکر ہے۔ اسلوب کا ذکر ہے۔ کئی بڑے بڑے ناموں ابن المقفع، رئیس جاحظ کا ذکر ہے لیکن انشا پردازی کے حوالے سے تاہم نثری افسانوں کے حوالے سے عربی ادب کی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ عربی ادب میں اگر آپ بعد کی چیزیں پڑھیں گے تو وہاں بھی نثری افسانوں کا ارتقا لگ بھگ اردو افسانوں کے ساتھ ہی ہوا ہے اور فارسی میں بھی یہی صورت حال ہے اس لیے آپ جب فکشن کی بات کریں گے تو آپ کو لامحالہ مغربی حوالوں سے ہی بات کرنی پڑے گی۔

اسد ثنائی: آپ نے اپنے حالیہ مضمون ''افسانے کے قواعد'' مطبوعہ شب خون شمارہ 285 میں جن افسانوں اور افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے ان افسانوں میں علائم، تمثیل، تجریدیت یا اشاریاتی زبان کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جب کہ جدیدیت میں ان کا ہونا لازمی ہے۔ میرے خیال میں انتظار حسین، انور سجاد، سمیع آہوجہ اور مظہر الزماں خاں کے ہاں کثرت سے یہ چیزیں پائی جاتی ہیں؟

سکندر احمد: آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ انور سجاد کا ذکر میں نے کیا اور آپ نے جو نام لیے ہیں ان کا بھی میں نے ذکر کیا۔ ان کے یہاں تمثیل، اشاریے، علامتیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ جدید افسانوں میں یہ ہوں اور کوئی ضروری نہیں کہ جدید افسانوں میں یہ نہ ہوں۔ آپ فکشن کی اگر بات کریں گے تو ایک بندھے ٹکے فارمولا کے کردار ہوں گے، واقعات ہوں گے، پلاٹ ہوگا، زاویۂ نگاہ ہوگا لیکن جدید افسانوں نے اس فارمولا بازی کو بالکل توڑ دیا ہے۔ جدید افسانوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بندھے ٹکے فارمولے سے روگردانی کر کے بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ بغیر پلاٹ کے بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ انتظار حسین نے بھی کہیں یہ لکھا ہے کہ یہ کب کا پرانا ہو چکا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا ''آب گم'' آپ نے پڑھا ہوگا۔ آپ دیکھیے اس میں کہیں پلاٹ نہیں۔ واقعات کا تسلسل بھی۔ آغاز بھی ہے۔ اختتام بھی ہے لیکن کہیں

بھی پلاٹ نہیں ہے۔ آب گم اردو فکشن کا ایک سنگ میل ہے۔ آپ دیکھیے کہ ایک ہی کردار کو لے کر افسانے لکھے گئے۔ آپ تجربہ کر کے تو دکھا سکتے ہیں کہ میں نے ایک کردار کو لے کر پورا افسانہ لکھ دیا۔ لیکن پورا پورا ناول لکھ دیں اور اس میں کہیں کوئی پلاٹ نہیں ہے یہ بڑی بات ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جدیدیت کے اسلوب میں لکھا گیا ''آب گم'' شاید اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول کی حیثیت کا حامل ہے۔ جدیدیت سے کہانی پن غائب ہونے کا رونا رونے والوں کو ''آب گم'' پڑھنا چاہیے اور ضرور پڑھنا چاہیے۔

اسد ثنائی: آپ کو اردو دنیا ایک ایسے شخص کی شکل میں پہچانتی ہے کہ جس نے ''مابعد جدیدیت'' کو اردو ادب میں داخل ہونے سے پہلے ہی باہر کا راستہ دکھا دیا۔ آپ کا کیا کہنا ہے؟

سکندر احمد: دیکھیے مابعد جدیدیت کوئی قلعہ نہیں تھا جسے میں نے منہدم کر دیا۔ یہ ایک ہوائی قلعہ تھا، ایک فریب نظر (Optical Illusion) تھا جسے چند شعبدہ باز نقادوں نے کھڑا کیا تھا۔ انھوں نے ''معمار ادب'' نام کا ایک ترجمان بھی شروع کیا تھا، جس کا اسقاط ہو گیا۔ مابعد جدید ادب کا کوئی خدوخال نہیں، کوئی ڈکشن نہیں، کوئی اسلوب نہیں۔ کسی Optical Illusion کو منہدم نہیں کیا جا سکتا صرف یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ ایک فریب نظر ہے۔ میں نے صرف یہی کیا ہے۔ مابعد جدیدیت کو بے نقاب کرنے میں احمد ہمیش کا بھی اہم رول ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسد ثنائی: یہ تو ہمارے لیے انکشاف ہے کہ مابعد جدید ادب کی کوئی شناخت نہیں؟

سکندر احمد: یہ میری ذاتی رائے ہی نہیں، ماہرینِ مابعد جدید ادب بھی یہی فرما رہے ہیں۔ Michael Berube (مائکل بیروب) جنھیں Illinois University میں دس برسوں تک ''Postmodernism and American Fiction پڑھانے کا شرف حاصل تھا، ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "Teaching Post modern fiction without being sure that the genre exists" یعنی ''مابعد جدید فکشن کی تدریس بغیر یہ جانے ہوئے کہ آیا یہ صنف ہے بھی یا نہیں۔'' مضمون میں آگے چل کر انھوں نے اعتراف کیا کہ مابعد جدید فکشن کی کوئی صنفی حیثیت نہیں۔

اسد ثنائی: مائکل بیروب کوئی جانا پہچانا نام تو نہیں؟

سکندر احمد: بجا فرمایا، مگر کیا کیجیے کہ اہاب حسن نے اپنے اسی انٹرویو میں جسے انھوں نے پرنسٹن یونیورسٹی کے فرینک سیانی کو دیا تھا، خود کہا کہ وہ رابرٹ سٹور کے اس خیال سے متفق ہیں (اور نہیں بھی) کہ مابعد جدیدیت ذہن کو پراگندگی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا مشہور خاکہ جس میں انھوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فرق کو واضح کیا تھا، پراگندگی کا شکار ہے یعنی وہ عوامل و نکات جن کے ذریعے، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فرق کو واضح کیا تھا، آپس میں مدغم نہیں۔

اسد ثنائی: یہ چارٹ کہاں دستیاب ہے؟

سکندر احمد: یہ اہاب حسن کے مضمون Towards a concept of post modernism کا حصہ تھا، جسے انھوں نے Dismemberment of Orphens کے پس نوشت کے طور پر شامل کیا ہے۔

اسد ثنائی: آخر یہ لفظ Post modernism آیا کہاں سے؟

سکندر احمد: سب سے پہلے اسے برطانوی پینٹر John Watkins Chapman نے 1870 میں استعمال کیا۔ بعد ازاں، فریڈریکوڈی آنس، برنارڈ اسمتھ، ڈڈلی فٹس، آرنلڈ ٹائنبی، چارلس آلسن، اروِنگ ہو، ہیری لیون وغیرہ نے تواتر سے استعمال کیا۔

اسد ثنائی: بعض اس کا کریڈٹ اہاب حسن کو دیتے ہیں؟

سکندر احمد: اہاب حسن کو اس سے انکار ہے۔

اسد ثنائی: آپ نے کہا کہ مابعد جدیدیت کے ادبی خدوخال واضح نہیں ہیں ایسی صورت میں بدنام زمانہ مصنف سلمان رشدی کے ناول "The Satanic Verses" کو مابعد جدید ناول کیوں کر کہا جاتا ہے؟

سکندر احمد: "The Satanic Verses" کی شہرت کی وجہ مابعد جدیدیت ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے جس سے آپ بھی واقف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسے ایک مابعد جدید فکشن کے نمائندہ متن کی شکل میں دیکھا جاتا ہے تاہم سلمان رشدی کی کتابوں میں مابعد جدید نکات کی تلاش، شائع ہونے کے بعد کی گئی۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ رشدی کی کتابوں سے پہلے پہل مابعد جدیدیت Brian Mchale نے دریافت کیا جو کبھی امریکہ اور کبھی اسرائیل میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔ سلمان رشدی اور مابعد جدید کا ایک Vicious Circle ہے یعنی رشدی جو کچھ لکھتے ہیں مابعد جدیدیت بن جاتی ہے اور جو کچھ مابعد جدیدیت کہتی ہے وہی رشدی لکھتے ہیں۔ اگر آپ عقل مند ہیں تو آپ مابعد جدیدیت کے اغراض و مقاصد کو آسانی سے دریافت کر سکتے ہیں۔

اسد ثنائی: آواں گارد تحریک اور مابعد جدیدیت کے مابین کوئی تعلق ہے؟

سکندر احمد: ہے تو مگر دور کا۔ بریڈ ہالینڈ (Brad Holland) نے اپنے مضمون "Express yourself : It's better than you think" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ آواں گارد تحریک فرانسیسی لاابالیوں (French Bohemian) کی تحریک تھی۔ ان کے نزدیک آرٹ کا مقصد ہے کہ مڈل کلاس کو چونکا دیا جائے۔ مابعد جدیدیت کچھ ایسا کرنا چاہتی ہے کہ آواں گارد خود چونک جائیں۔

اسد ثنائی: کیا آپ کے خیال میں مابعد جدیدیت دم توڑ چکی ہے؟

سکندر احمد: دم ہی نہیں تھا۔

اسد ثنائی: مابعد جدیدیت کے حوالے سے عجیب وغریب اصطلاحات سامنے آتے ہیں جو ڈکشنری میں نہیں ملتے؟

سکندر احمد: جی ہاں ایسے اصطلاحات ہیں۔

اسد ثنائی: مثلاً؟

سکندر احمد: اصطلاحات تو بہت ہیں، آپ کی مراد کن اصطلاحات سے ہے؟

اسد ثنائی: Deconstruction، hyper reality، hyper text، sinulecra، metanarrative وغیرہ۔

سکندر احمد: اسد صاحب یہ اصطلاحات اپنے آپ میں کافی گنجلک ہیں تاہم میری کوشش ہوگی کہ انھیں سہل ترین انداز میں سمجھا جائے۔ ڈی کنسٹرکشن دریدا کی وضع کردہ اصطلاح ہے، مختصراً آپ یہ سمجھ لیں کہ متن جو کہ ایک لفظ پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے کے کوئی متعین معنی نہیں ہوتے۔ اب آپ اسے یوں سمجھیں کہ آئن اسٹائن نے بلیک بورڈ پر لکھا $E=mc^2$ اور ہیروشیما اور ناگاساکی آگ میں جھلس گئے۔ اگر آپ ڈی کنسٹرکشن پر یقین رکھتے ہیں تو آئن اسٹائن اس المیے کی اخلاقی ذمہ داری سے بچ نکلے گا۔ Hypertext کو آپ زائد از متن کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک متن ہے جو بیک وقت تہہ بہ تہہ چلتا ہے، اس کی متعین سمت نہیں ہوتی، نہ ہی کوئی منطقی انجام ہوتا ہے۔

اسد ثنائی: اور Hyperreality

سکندر احمد: آپ اسے زائد از اصل کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی قوم کے پاس کوئی آثار قدیمہ نہیں ہے، مگر طاقت اور دولت ہے۔ اگر وہ تاج محل کی نقل تیار کریں اور اس میں جدید ترین آلات نسب کر کے چند ایسی خصوصیات پیدا کر دیں جو اصل تاج محل میں نہیں ہوں۔ وہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگرچہ تاج محل (Reality) ان کے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا ان کے پاس اس کا زائد از اصل (Hyperreality) تو ہے۔

اسد ثنائی: کیا یہ صحیح ہے کہ مابعد جدیدیت اخلاقی قدروں کی قائل نہیں ہے؟

سکندر احمد: جی ہاں یہ صحیح ہے۔ دراصل یہ کسی ازلی سچائی کی قائل نہیں۔ ازلی سچائیاں Metanarrative ہیں۔ جیسے ''مظلوم کو مت ستاؤ''۔ مابعد جدیدیت لفظ مظلوم کی کچھ ایسی وضاحت پیش کرے گی کہ ظالم ہی مظلوم نظر آنے لگیں گے۔ یہ Power game یعنی طاقت کا کھیل ہے۔ الفاظ کے معنی کا تعین وہ کریں گے جن کے پاس طاقت ہے۔ مابعد جدیدیت کے یہاں اصل کی کوئی قیمت نہیں، نقل اور اصل میں کوئی فرق نہیں۔ میوزک کے سی ڈی اس کی مثال ہیں۔ اس تصور کو ہی simulacra کہتے ہیں۔ یہ جمع ہے واحد simulacrum ہے۔ بودریار نے اس تصور کو پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق عراق کی جنگ، جنگ نہیں تھی بلکہ جنگ کی شبیہ محض تھی جو ٹیلی ویژن کے پردوں پر ڈرائنگ روم میں لڑی گئی۔

اسد ثنائی: ترقی پسند ادب کے اثرات کیا اب بھی باقی ہیں؟

سکندر احمد: دیکھیے، ترقی پسند خلا میں پیدا نہیں ہوا تھا، نہ یہ صرف اردو کی حدود میں مقید تھا۔ اشتراکیت کے دم توڑنے کے بعد تحریک کمزور تو ہوئی ختم نہیں ہوئی۔ ویسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو خود کو ترقی پسند کہتے ہیں۔ بات ظاہر ہے جب تک ادیب زندہ ہے ادب زندہ ہے۔ تاہم یہ تحریک قریب المرگ ہے۔

اسد ثنائی: کیا جدیدیت نے ترقی پسند ادب کو نقصان پہنچایا؟

سکندر احمد: جی نہیں، ترقی پسند ادب اپنے زوال کی ذمہ دار خود ہے۔

اسد ثنائی: وہ نسل جس کی شب خون اور شمس الرحمٰن فاروقی نے آبیاری کی تھی ان میں آج کتنے شجر ثمر آور اور تناور ہو چکے ہیں؟

سکندر احمد: نام تو کئی ہیں کن کن کا شمار کیا جائے۔

اسد ثنائی: ان میں سکندر احمد بھی تو شامل ہیں؟

سکندر احمد: No Comments

اسد ثنائی: کیا فاروقی صاحب سے اختلاف کیا جا سکتا ہے؟

سکندر احمد: جی ہاں، بالکل کیا جا سکتا ہے۔

اسد ثنائی: بہت کم عرصہ میں آپ نے ہندوپاک کے ممتاز نقادوں میں اپنے آپ کو شمار کروالیا ہے؟

سکندر احمد: ابھی تو مجھے بہت لمبا سفر طے کرنا ہے اس لیے فی الوقت کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

(بشکریہ ''الانصار'' حیدرآباد، جلد۔3، 2005، شمارہ۔3)

* * *

مسعود حسین **ہماری مطبوعات سے** **"مقالاتِ مسعود" سے ماخوذ**

مطالعۂ شعر (صوتیاتی نقطۂ نظر سے)

لسانیاتی مطالعہ، دراصل، شعریات کا جدید ہیئتی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ جامع ہے اس لیے کہ شعری حقیقت کا کلی تصور پیش کرتا ہے۔ ہیئت و موضوع کی قدیم بحث اس نقطۂ نظر سے بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ کلاسیکی نقد ادب کے اصولوں کی تجدید کرتا ہے اور قدما کے مشاہدات اور اصطلاحات ادب کو سائنسی بنیاد عطا کرتا ہے۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر صوتیات کی سطح سے ابھرتا ہے اور ارتقائی صوتیات، تشکیلات، صرف و نحو اور معنیات کی پُر پیچ وادیوں سے گزرتا ہوا "اسلوبیات" پر ختم ہوتا ہے۔ "اسلوبیات" کو ابھی تک ماہرین لسانیات علم اللسان کا حصہ تسلیم نہیں کرتے، گو فرانسیسی زبان کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی ہو چکا ہے اور اس کے جمالیاتی استعمال کو لسانیات کی اصطلاحات میں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں ہو چکی ہیں۔ ان ذہنی کاوشوں نے تنقید شعر کا ایک نیا لسانیاتی (سائنسی) رخ متعین کر دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ توقع بھی کہ زبان کے تخلیقی استعمال کو علم بہت جلد اپنی گرفت میں لا سکے گا۔

جدید تنقید، بوجوہ، سماجی علوم کا بہت زیادہ سہارا لیے ہوتے ہیں۔ اس سے مکمل چھٹکارا تو کسی خیال پرست کا محض تصور ہوگا۔ لیکن جہاں تک فن شعر کا تعلق ہے، بہتیرے نابلدِ فن بھی سماجی علوم کے فارمولوں کے ذریعے نقادِ شعر ہونے کا دم بھرنے لگے ہیں۔ اس میں شک نہیں زبان ایک سماجی مظہر ہے۔ لیکن بحیثیت ایک مظہر کے یہ سماج کے اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیوں کے تابع اس طور پر نہیں ہوتی جیسا کہ انقلاب روس کے بعد کے روسی ماہرین لسانیات نے ثابت کرنا چاہا تھا۔ سماج کے دیگر نظاموں اور اداروں کی طرح زبان اس کی اقتصادی اساس کی اوپری پرت نہیں ہوتی کہ طبقاتی انقلاب اس کی نوعیت کو یک لخت بدل دے۔ یہ سماج کا ایک محکم اور پائیدار نظام ہوتی ہے۔ اس طرح شعر انفرادی ذہن کی تخلیق ہونے کی حیثیت سے حرف و صوت کی تہ میں انفرادیت کی توانائی کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی لیے مارکس بھی اس مشاہدہ پر مجبور تھا کہ "فنون لطیفہ کی اعلیٰ ترین ترقی کے بعض ادوار کا سماج کے عام ارتقا یا اس کی مادی اساس و تنظیمی ساخت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔" انفرادی زندگی قطعی طور پر سماجی زندگی سے مربوط ہے۔ بعینہٖ جس طرح ہم سماجی زندگی کو طبیعی ماحول سے مربوط دیکھتے ہیں۔ لیکن حیات اپنے ارتقا کی ہر سطح پر نئی ترکیب اور نئی تکنیک ڈھالتی ہے یہی ترکیب وہ محکم قدر ہوتی ہے جس کو سمجھنا اور سمجھانا اس سطح کے محقق کا اصل کام ہے۔

شعر انفرادی ذہن کے طلسم کا گنجینۂ معنی ہوتا ہے اور اس نوعیت کے لیے ضروری ہے کہ نقادِ شعر، اسے خود اسی کے معیار پر پرکھے۔ یہ معیار جمالیاتی عمل کے ان دائروں سے بنتا ہے جو ذہن شاعری اور لسانیاتی مواد کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سماجی علوم کے تصورات نے ادبی تنقید کو اس کے اصل محور سے دور کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمرانی تنقید سے اس کو ایک فلسفیانہ پس منظر ملتا ہے لیکن اس پس منظر میں فن پارہ اکثر غائب ہو جاتا ہے۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر میں نہ تو فن کار کا ماحول اہم ہوتا ہے اور نہ خود اس کی ذات۔ اہمیت دراصل ہوتی ہے اس فن پارے کی جس کی راہ سے ہم اس کے خالق کی ذات اور ماحول دونوں میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

لسانیات کی پہلی سطح صوتیات ہے جس پر ناقد شعر کا عمل شروع ہونا چاہیے۔ اس کا احساس قدیم زمانے سے ناقدین شعر کو رہا ہے۔ سنسکرت "بوطیقا" میں آوازوں کے خوش آہنگ یا بد آہنگ ہونے کا تذکرہ بار ہا ملتا ہے۔ صوت و معنی میں جو باہمی رشتہ ہوتا ہے اس کا ذکر بھی مغربی تنقید اور اس کی پیروی میں کبھی کبھی اردو تنقید میں بھی مل جاتا ہے لیکن یہ تمام تنقیدی کاوشیں کسی مربوط لسانیاتی نقطۂ نظر کے تحت نہیں ملتیں۔ ان کی نوعیت عام طور پر تاثراتی یا ذوقی ہے۔ اس لیے کہ ناقدین کو اپنے مشاہدات کی علمی بنیاد کا علم نہیں۔

اس علمی بنیاد کے لیے آوازوں کے مخرج، ان کی ادائگی اور باہمی ربط پر نظر رکھنی پڑے گی۔ ہر زبان کی بنیادی آوازوں کے باہمی آہنگ ہی سے

"مقالات مسعود" ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے 16 لسانی اور علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ 230 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 18.50 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت بھی دیتی ہے۔

شعر و نغمہ کے تارو پود تیار ہوتے ہیں۔ اس لیے موسیقی کی طرح کسی زبان کی غنائی شاعری کا بھی ایک قومی مزاج ہوتا ہے۔ یہ قومی مزاج ہم آہنگ یا متضاد یا متوازی آوازوں اور اس زبان کے مخصوص نظامِ صوت سے بنتا ہے۔ اس لیے جب ہم ایک غیر زبان کی شاعری سنتے ہیں تو اپنی صوتیاتی عادتیں یا پسند اور ناپسند کو اس زبان کے نظامِ صوت میں منتقل کر دیتے ہیں اور اس کے اسی حصے کو لائقِ تحسین سمجھتے ہیں جس کا آہنگ ہمارے کانوں میں پہلے سے رچا ہوا ہے۔

ادب کی دوسری اصناف کے مقابلے میں شعر کا صوتی مطالعہ تاثراتی اور ذوقی تنقید کی اکثر اصطلاحوں کو ایک علمی اساس بخشتا ہے اس لیے کہ شعر نہ صرف پڑھنے کی چیز ہے بلکہ سننے اور گانے کی بھی، تنقیدِ شعر میں اکثر ''لہجہ'' کا (بلکہ لب و لہجہ کا) ذکر ملتا ہے۔ ''مدھم یا پنجم سروں'' کا تذکرہ ملتا ہے۔ ''لے'' اور ''نغمگی''، ''روانی'' اور ''ربط'' پر زور دیا جاتا ہے۔ تاثراتی تنقید کے یہ احساسات عام طور پر صحیح ہوتے ہیں۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر ان تاثراتی کلمات کی سائنسی بنیاد تلاش کرتا ہے اور اس کوشش میں کل زبان کے صوتیاتی نظام کا تجزیہ کرتا ہے۔

اردو کے نظامِ صوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مصوتے: جو تعداد میں دس ہیں۔ 2. مصمتے: جن کی تعداد 37 ہے۔

چوں کہ مصمتے آواز کے بہاؤ میں وہ چوٹیاں ہیں جن پر مصوتوں کا نغمۂ مس کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی ادائیگی اور مخرج کے بارے میں تفصیل سے جاننا ضروری ہے۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے ان آوازوں کی حسب ذیل طریقے پر ترتیب دی جا سکتی ہے۔

حروفِ صحیح

			لہاتی (کوّے کی)	غشائی	غاری (تالوی)	کوز (مڑی ہوئی)	لثوی (اوپر کے مسوڑوں کی)	دندانی	لب دندانی	دولبی
منہ بند آوازیں	غیر مسموع	بغیرِ ہ مخلوط	ق	ک	چ	ٹ		ت	.	پ
		معِ ہ مخلوط		کھ	چھ	ٹھ		تھ	.	پھ
	مسموع	بغیرِ ہ مخلوط		گ	ج	ڈ		د	.	ب
		معِ ہ مخلوط		گھ	جھ	ڈھ		دھ	.	بھ
چتال		غنہ مسموع						ن		م
		غیر مسموع	ہ	خ	ش		س		ف	
		مسموع		غ	و		ز		و	
		تھپک دار (کوز)				ڑ، ڑھ				
		بغلی					ل			
		نیم مصوتہ			ی					

اردو مصوتوں کی کل تعداد=37

مذکورہ بالا جدول میں افقی تقسیم مخرج کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے اور عمودی تقسیم انداز ادائیگی کے نقطۂ نظر سے اردو کے حروفِ صحیح کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خالص ہندی آوازوں کے ساتھ ساتھ اس میں خالص عربی اور فارسی آوازیں بھی شامل ہیں۔ چونکہ ہماری شاعری کی صوری روایت فارسی اور عربی سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس لیے اردو کے حروفِ صحیح کا حسب ذیل تجزیہ لائقِ توجہ ہے۔

1. خالص ہندی آوازیں: ٹ۔ ڈ۔ ڑ
   کھ۔ چھ۔ ٹھ۔ تھ۔ پھ۔ گھ۔ جھ۔ ڈھ۔ دھ۔ بھ۔ ڑھ
2. خالص فارسی آواز: ژ
3. خالص عربی آواز: ق
4. عربی فارسی مشترک آوازیں: خ۔ غ۔ ف۔
5. فارسی ہندی مشترک آوازیں: ک۔ چ۔ ت۔ پ۔ گ۔ ج۔ د۔ ب۔
   ن۔ م۔ ش۔ س۔ ی۔ ر۔ ل۔ و۔ ہ۔
6. عربی ہندی مشترک آوازیں: ب۔ ت۔ ج۔ د۔ ر۔ س۔ ش۔ ک۔
   ل۔ و۔ ہ۔ ی۔
7. عربی فارسی ہندی مشترک آوازیں:
   ب۔ ت۔ ج۔ د۔ س۔ ش۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ و۔ ہ۔ ی۔

اردو شاعری کا تمام تر صوتی نظام مذکورہ بالا آوازوں کے تارو پود پر قائم ہے۔ حروفِ صحیح کے ان سنگ پاروں کو اردو کے دس حروفِ علت سے جوڑا جاتا ہے جن میں سے چار (ــِـ)، ی، اِے، اَے، منہ کے اگلے حصے سے برآمد ہوتے ہیں اور پانچ (اُ، اُ، اُو، اَو، او) منہ کے پچھلے حصے سے اور ایک (ــَـ) درمیانی حصے سے۔

اردو خالص صوتیاتی نقطۂ نظر سے بھی ایک ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن ہمارا شعری آہنگ بہت کچھ فارسی شعر گوئی کی روایات پر مبنی ہے۔ اردو شاعروں کا سابقہ خاص طور پر ہندی کی کوز (ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔) اور ہائے مخلوط والی آوازوں (کھ۔ چھ۔ دھ۔ وغیرہ) سے پڑا۔ اردو تاریخ صوتیاتِ شعر، تمام تر ان آوازوں کو ہضم کرنے کی داستان ہے۔ یہ داستان مرزا معز موسوی خاں فطرت کی:

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے
در خانہ آئینہ گتا جوم بری ہے

سے شروع ہوتی ہے اور میر و نظیر کے کوز آوازیں رکھنے والے الفاظ (ڈاگ ڈانس۔ ڈول۔ ڈھنڈ۔ ڈھیر۔ ڈھینڈس۔ لنڈھنا۔ ڈھب۔ بھڑک اور رنگاوٹ) سے گذرتی ہوئی غالب و اقبال کے فارسی صوتی آہنگ پر ختم ہوتی ہے۔ جب کبھی ہندیت اور ہندی لہجہ غالب آ جاتا ہے تو اس کا ٹھاٹھ یہ ہوتا ہے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اور جب غالب اردو کے لہجہ پر چھا جاتے ہیں تو یہ ''فردوس گوش'' بن جاتا ہے۔ صفحے کے صفحے الٹتے چلے جایئے ٹ۔ڈ۔ڑ۔ کی آوازیں اردو شاعری کے مقدس وید یعنی دیوانِ غالب میں نہیں ملتیں۔ یہی حال اقبال کا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹ۔ڈ۔ڑ (کوز آوازیں) بذات خود ناہنجار اور بد آہنگ ہوتی ہیں۔ ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ یہ تصور ایرانی، عربی، فرانسیسی یا اطالوی ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کی آریائی زبان کا شعری ادب ان آوازوں سے مملو ہے اور اس کی جڑیں ہندستانی موسیقی میں طبلے اور ڈھول کے رشتے سے پیوست ہیں۔ ان کے ناہنجار ہونے کا تصور دراصل پیدا ہوتا ہے اس ایرانی شعری روایت کی بدولت جو آج بھی ہماری شاعری پر سایہ فگن ہے اور جو کوز آوازوں کو حسب ذیل انداز میں ملائم بناتی ہے:

کروڑ کا کرور
ساڑی کا ساری
پھلواڑی کا پھلواری

لیکن اس احساس اور غالب و اقبال کے باوجود کوز آوازوں کو اردو شاعروں کے نازک ترین دماغوں (میر) نے قبول کیا ہے اور فارسی کی روایت کے ساتھ اس طرح ''گل، گل گلاب'' بنا دیا ہے کہ کوز آوازوں کی کوزیت ہمارے شعری آہنگ کا جزولاینفک بن گئی ہے۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

کوز آوازوں کے صوتی آہنگ ہی میں میر نے اپنے ''پھوڑوں'' کا ذکر کیا ہے۔ نظیر نے عوامی زبان کا 'ٹھاٹھ' باندھا ہے اور سودا اور انشا نے ظرافت کی کلیاں چٹکائی ہیں۔ مزاح کی یہ روایت جعفر زٹلی کی زٹلیات سے شروع ہوتی ہے اور سودا کی شعری ''بھیڑ بھاڑ'' سے ہوتی ہوئی دھرام، سے انشا تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے اکبر کی 'ڈانٹ ڈپٹ' اور 'رپٹ' میں نمودار ہوتی ہے۔ کوز آوازوں سے مرکب الفاظ جب قافیہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو ان سے عام طور پر کسی نہ کسی مضحک پہلو کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ چکبست کی حضرت کرزن سے 'جھپٹ' کسے از بر نہیں۔

آپ اگر منہ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منہ پھٹ!

ہندی کی ہائے مخلوط رکھنے والی آوازیں (کھ۔دھ۔بھ۔ وغیرہ) کو آوازوں کی بہ نسبت اردو شعری روایت میں زیادہ بہتر طریقے پر کھپ سکی ہیں۔ اس کی صوتیاتی وجہ یہ ہے کہ یہ آوازیں بذاتِ خود زیادہ دقت طلب نہیں دوسرے یہ کہ ان سے مرکب الفاظ کی تعداد اردو زبان میں بہت زیادہ بھی ہے۔ یہ آوازیں نہ صرف درمیان شعر میں واقع ہوتی ہیں بلکہ قوافی اور ردیف میں بھی نہایت کامیابی کے ساتھ لائی گئی ہیں۔ گو ان میں وہ روانی نہیں ملتی جو حروف علت (ا) یا (ی) (ن) یا (م) سے مرکب قوافی اور ردیف میں ملتی ہیں۔ تاہم دیکھیے میر کے مدھم لہجہ میں اسی سے کیا نغمہ برآمد ہوتا ہے:

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ
دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
حسرت وصل و غم ہجر و خیال رخ دوست
مرگیا میں، پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

میر تو تائے ہندی (ٹ) کی ردیف تک میں غزل لکھتے ہیں اور مزاح سے پہلو بچا کر ایسا جلا بھنا شعر کہہ لیتے ہیں:

دل ہے جدھر کو اودھر کچھ آگ سی لگی ہے
اس پہلو ہم جو لیٹے جل جل گئی ہے کروٹ

لیکن غالب اور اقبال ہائے مخلوط والی آوازوں کو بھی ردیف کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔(1) میر کی آہ وزاری کی واردات کھ۔ چھ۔تھ۔ پھ۔ کے صوتی آہنگ میں کامیابی کے ساتھ آہیں بھرتی ابھرتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی کثرت ان کے اشعار کی روانی کو کم بھی کر دیتی ہے۔ لیکن جذبے کا لہو اس کی رنگینی کو سنبھال لیتا ہے۔ اقبال کی فکر پرستی اور غالب کی حیات پرستی کا آہنگ ان سے بالکل مختلف حروف صحیح کا سہارا لیتا ہے نہ وہ اس قدر منہ پھٹ ہے جیسے کہ نظیر یا انشا کا، اور نہ اس قدر 'ہائے' بھرا جس قدر کہ میر یا فانی کا۔

دل فانی کی تباہی کو نہ پوچھ
الم لاانتہاہی کو نہ پوچھ
زندگی جادۂ بے منزل ہے
مسلک رہبر و راہی کو نہ پوچھ
غلط انداز نگاہوں کو سنبھال
میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ
منع ہے لذت غم بھی فانی
ہمہ گیری نواہی کو نہ پوچھ

اردو حروف صحیح، مسموع اور غیر مسموع آوازوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ تمام حروف علت مسموع آوازیں ہیں اور موسیقی کی جان ہیں۔ ان کے علاوہ گ۔گھ۔ج۔ جھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ د۔ دھ۔ ب۔ بھ۔ن۔م۔ غ۔ ڑ۔ ز۔ ژ۔ڑھ۔ر۔ی۔ل۔و۔

مسموع حروف صحیح ہیں، یعنی اردو شاعری کے تانوں بانوں میں کل دس حروف علت، اکیس حروف صحیح، کل اکتیس مسموع آوازیں ہیں۔ غیر مسموع آوازیں تعداد میں کل سولہ ہیں۔

ک۔کھ۔ چ۔ چھ۔ ٹ۔ٹھ۔ ت۔تھ۔ پ۔ پھ۔ خ۔ش۔س۔ ف۔ہ۔ق۔

ان آوازوں سے ہماری شاعری میں صوتی وادیاں بنتی ہیں، کیوں کہ موسیقی کی بنیاد مسموع آوازوں بالخصوص حروف علت پر ہوتی ہے۔ گلے کے پردوں کے زیر و بم میں تمام راگوں کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غنائی

شاعری کی حیثیت سے غزل موسیقی سے قریب ترین ہے۔ اسی لیے غزل میں جس قدر غنائیت ہوگی اسی قدر اس کے الفاظ میں حروفِ علت کی بہتات ہوگی۔ حروفِ علت کے بعد ترجیح مسموع حروفِ صحیح کو دی جائے گی اور غیر مسموع آوازوں کا تناسب عام طور پر 1/3 سے زیادہ نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر میر یا غالب کی مشہور نغمہ ریز غزلوں کا جائزہ لیجیے۔

1. الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
2. نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

تو حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

ہر صورت میں حروفِ علت کی تعداد سب سے زیادہ ملتی ہے اس کے بعد مسموع حروفِ صحیح آتے ہیں اور سب سے آخر میں غیر مسموع۔ دو غیر مسموع آوازوں کا اتصال بہ مشکل ملے گا، جب کہ مسموع مرکب بھی آتے ہیں۔ عام طور پر غنائی ردیفیں ا۔ و۔ ی۔ سے مرکب ہوتی ہیں یا 'ز' اور 'ل' سے غیر مسموع حروفِ صحیح کی ردیفوں میں اساتذہ نے کہا ضرور ہے۔ مثلاً

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

مگر 'ز' سے ارتقا کی عدم موجودگی کی وجہ سے رواں نہیں ہوتیں۔ حروفِ علت والی ردیفوں میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ انھیں موسیقی کی ضرورت کے مطابق کھینچ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر ہمارے اساتذہ غزل نے اچھا اور زیادہ 'ا'۔ 'و'۔ اور 'ی'۔ کے ردیفوں ہی میں کہا ہے۔

حروفِ علت کی کمی بیشی شعر کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چھوٹی یا طویل بحروں میں حزن و یاس کی کامیاب ترجمانی کا انحصار بہت کچھ حروفِ علت کی کثرت پر ہوتا ہے۔ غالب کی دونوں مشہور غزلوں میں:

1. دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
2. کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

حروفِ علت اور حروفِ صحیح کا تناسب 50 فیصد کا ہے۔ اس کے برعکس ان کی فکر یہ غزل:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میں حروفِ علت کا تناسب گھٹ کر 40 فیصد رہ جاتا ہے۔ مذکورہ بالا غزلوں کا صوتیاتی تجزیہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جب جذبہ دل کی آنچ بن کر برآمد ہوتا ہے تو وہ حروفِ صحیح کی رکاوٹوں کو کم قبول کرتا ہے اور حروفِ علت کی گزرگاہوں کو پسند کرتا ہے۔ موجودہ تنقید میں اس قسم کی تاثراتی اصطلاحات اور تراکیب کا جواز کہ میر کی شاعری کا لہجہ "مدھم" ہے یا غالب "بلند بانگ" انداز میں نغمہ سرا ہوتے ہیں صرف یہی ہو سکتا ہے کہ میر طویل حروفِ علت (ا۔ و۔ ی۔) بکثرت استعمال کرتے ہیں اس درجہ کہ کوز آوازوں کے روڑے تک ان کے آہنگ میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس غالب کوز آوازوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے وہ فارسی صوتیاتی آہنگ کے جلتے سروں میں گاتے ہیں۔ جلتے سروں کی صوتیاتی توجیہ یہ ہے کہ وہ عربی و فارسی چستانی آوازوں (رگڑ کے ساتھ پیدا ہونے والی آوازیں مثلاً خ۔ ش۔ ف۔ ز۔ وغیرہ) سے اپنا صوتی آہنگ تیار کرتے ہیں اور بیشتر انھیں ن۔ م۔ کی انفی موسیقی کا پس منظر عطا کرتے ہیں۔ یہی آہنگ اقبال کا ہے۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے میر کے انداز کی ناتمام توسیع فراق کے کلام میں ملتی ہے جو صوتیات اور آہنگ دونوں کی سطح پر بے شمار "پیوند" پیش کرتی ہے۔

اردو شاعری کے صوتی تار و پود میں ق۔ خ۔ اور غ بہت کم اثر انداز ہوئے ہیں۔ ق کی صوتی قدر سے اردو داں طبقے کا بڑا حصہ (مغربی پاکستان باستثنیٰ صوبۂ سرحد) بے بہرہ ہے۔ خ اور غ بھی لہائی یا غشائی چستانی آوازیں ہونے کی حیثیت سے ہندی آوازوں سے بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں۔ میر کے دل کی تپش اور اقبال کی فکر کی روشنی بھی صوت کی ان اکائیوں کو فردوسِ گوش نہ بنا سکیں۔

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ   کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
تم اور ہم سے محبت تمھیں خلاف خلاف   ہم اور الفتِ خوب دگر دروغ دروغ
کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میر سے تو   وہ اور اس کو کسو پر نظر دروغ دروغ
(میر)

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق   یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں   فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق
اگر وہ عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی   نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
(اقبال)

ان غزلوں پر اعتراض معنوی حیثیت سے نہیں صرف صوتی حیثیت سے عائد ہوتا ہے بلکہ جب یہ خیال آتا ہے کہ خود اقبال کے کانوں میں "ق" کا نغمہ "ک" کی شکل میں نمودار ہوا ہوگا تو لہائی منہ بند آواز (ق) کی "حلقیت" ختم ہو جاتی ہے اور اس کی بجائے غشائی منہ بند آواز (ک) کا نغمہ سنائی دیتا ہے، جس سے ہمارے کان آشنا ہیں۔

اردو شاعری کے صوتیاتی تجزیے سے تنقید شعر کی بعض ایسی اصطلاحوں کا بھی علمی جواز مل جاتا ہے جنھیں اساتذہ نے قدیم زمانے سے استعمال کیا ہے۔ ان میں قابلِ ذکر تنافرِ لفظی اور نقص روانی ہیں۔ عیب تنافر کے زیرِ عنوان حسرت موہانی "معائبِ سخن" میں لکھتے ہیں:

"جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل آ جاتے ہیں جن میں سے پہلے لفظ کا حرف آخر وہی ہوتا ہے جو دوسرے لفظ کا حرف اول ہوتا ہے تو ان دونوں حرفوں کے ایک ساتھ تلفظ میں ایک قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام عیب تنافر ہے۔

مثالیں:

آنکھوں میں میری عالم سارا سیاہ ہے اب (سیاہ ہے) میر
اس کی چشم سیہ ہے وہ جس نے (سیہ ہے) میر
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے (خلق کو) غالب
اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں (اشک کو)
اب عشق کو درکار ہے اک عالمِ حیرت (عشق کو)
اے ذوق دیکھ! دختر رز کو نہ منہ لگا (دختر رز)
اس کی تمکینِ ناز سے مجروح (ناز سے)
مخمور مجھے بادۂ سرخوش سے چھکایا (بادۂ خوش سے)

قدیم تنقید میں حرف اور لفظ دونوں کا تصور غلط ہے۔ اس لیے کہ عیب تنافر صوتیات کا مسئلہ ہے نہ کہ رسم الخط اور صرف کا۔ اوپر تنافر کی جس قدر مثالیں دی گئی ہیں ان کے صوتیاتی اصول ذیل میں مرتب کیے جاتے ہیں:

1. ایک ہی آواز بالخصوص منہ بند آوازوں کی علی الترتیب ادائگی مشکل ہوتی ہے۔

اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں (ک)

اس کی عضویاتی وجہ ظاہر ہے۔

2. ہم مخرج آوازوں، مثلاً ک، گ، س، ز وغیرہ کی علی الترتیب ادائگی میں دشواری ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلی غیر مسموع ہیں اور دوسری (گ۔ز۔) مسموع ہیں۔ ایسی صورت میں لازماً ادغام کا عمل پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے پہلی غیرمسموع آواز آنے والی مسموع آواز کے زیر اثر مسموع بن جاتی ہے۔ عام طور پر حسب ذیل انداز میں ہوتی ہیں اور ان کا قدیم سنسکرت کے قواعد نویسوں نے بالتفصیل ''سندھی'' کے نام سے مطالعہ کیا ہے۔

غیرمسموع	مسموع	تبدیل شدہ شکل
پ	ب	ب
ت	د	د خونے تیری افسردہ کیا وحشت دل کو (غالب)
تھ	د	د
ٹ	ڈ	ڈ
ٹھ	ڈ	ڈ
ک	گ	گ
چ	ج	ج
ف	و	و
س	ز	ز
خ	غ	غ

یہ عمل الٹا بھی ہوسکتا ہے اگر لفظ میں مسموع آواز پہلے اور غیر مسموع بعد کو واقع ہو مثلاً

غیرمسموع	مسموع	تبدیل شدہ شکل
ب	پ	پ
د	ت	ت
ز	س	س: اس کی تمکین نا(س) سے مجروح
گ	ک	ک: مددائے مر(ک) کہ گھیرا ہے قضا نے ہم کو
غ	خ	خ: اے دا(خ) خاک پائے رسولِ خدا ہیں ہم

3. قریب المخرج آوازوں میں تنافر اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ادائگی کے وقت روانی میں مخرج قریب ہونے کی وجہ سے وہی عضویاتی دقت پڑتی ہے جو ایک ہی آواز کو علی الترتیب ادا کرنے میں ہوتی ہے۔

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

یہاں 'ق' حلقی ہے اور 'ک' غشائی

مخمور مجھے بادۂ سر خوش سے چھکایا

یہاں 'ش' اور 'س' قریب المخرج چستانی تلفظ کی آوازیں ہیں۔ ''ش'' تالو کی آواز ہے اور 'س' دانتوں کے پیچھے سے برآمد ہوتا ہے۔ 'س' کی 'ش' میں تبدیلی تاریخی صوتیات کا ایک دلچسپ مظہر بھی ہے۔

---

(1) ردیف 'ہ' میں غالب کے منتخب دیوان میں صرف تین معمولی شعر ہیں۔

□□□

قلم کار حضرات سے گزارش ہے کہ
صاف اور خوش خط تحریریں ارسال فرمائیں۔
فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قابل قبول نہ ہوں گی۔ (ادارہ)

احمد کفیل

کوئز

اردو ادب (1950 کے بعد)

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہونے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے
یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

(الف) ناصر کاظمی (ب) فراق گورکھ پوری
(ج) ابن انشا (د) شہریار

(2) پاکستان کے نئے شاعروں میں محمد حسن عسکری نے کس شاعر کو زیادہ اہمیت دی ہے؟

(الف) ناصر کاظمی (ب) افتخار عارف
(ج) احمد مشتاق (د) سلیم احمد

(3) فراق نے ایک شاعر کے شعری مجموعے پر "اے اہل ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو" تحریر کیا ہے۔ اس شاعر کا نام کیا ہے؟

(الف) کلیم عاجز (ب) نشتر خانقاہی
(ج) عرفان صدیقی (د) حسن نعیم

(4) حسن نعیم کا کون سا مجموعۂ کلام ان کی وفات کے بعد شائع ہوا؟

(الف) اشعار (ب) غزل نامہ
(ج) دبستان (د) دیوان

(5) 1955 میں نئی غزل کے تین مجموعے "برگ نے" "کاغذی پیرہن" اور "چاند نگر" شائع ہوئے۔ مذکورہ مجموعوں کی ترتیب کے حساب سے متعلقہ شعرا کی ترتیب کیا ہوگی؟

(الف) ابن انشا، خلیل الرحمن اعظمی، ناصر کاظمی
(ب) ناصر کاظمی، ابن انشا، خلیل الرحمن اعظمی
(ج) خلیل الرحمن اعظمی، ناصر کاظمی، ابن انشا
(د) ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، ابن انشا

(6) کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہو گیا دیوار و در کے درمیاں
یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

(الف) مخمور سعیدی (ب) محمد علوی
(ج) افتخار عارف (د) احمد فراز

(7) بانی کا پورا نام کیا ہے؟

(الف) راجندر منچندا (ب) سریندر منچندا
(ج) ناگیندر منچندا (د) ہریندر منچندا

(8) "پالکی کہکشاں کی" کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟

(الف) ابن انشا (ب) احمد مشتاق
(ج) عرفان صدیقی (د) مظہر امام

(9) 'آزاد غزل' کا بانی کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(الف) مظہر امام (ب) قتیل شفائی
(ج) حنیف ترین (د) ظہیر صدیقی

(10) ظفر اقبال کا مجموعۂ کلام ذیل میں سے کون سا ہے؟

(الف) حرفِ معتبر (ب) آبِ رواں
(ج) بوئے آوارہ (د) آسماں اے آسماں

(11) کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا
یہ شعر کس کا ہے؟

(الف) بشیر بدر (ب) ندا فاضلی
(ج) بشر نواز (د) شہریار

(12) مجروح سلطان پوری کا اصل نام کیا ہے؟

(الف) اظہار حسن خاں (ب) مسرور حسن خاں

(ج) مقبول حسن خاں (د) اسرار حسن خاں

(13) مشہور نظم "ایک لڑکا" کس کی تخلیق ہے؟

(الف) بلراج کومل (ب) اختر الایمان

(ج) کمار پاشی (د) محمد علوی

(14) خالص نظم گو کی حیثیت سے کس شاعر نے اپنی شناخت قائم کی؟

(الف) قاضی سلیم (ب) کمار پاشی

(ج) بلراج کومل (د) عمیق حنفی

(15) "حسن نعیم کی غزلوں کے مرکزی کردار کا تیور ناصر کاظمی اور ابن انشا کے تھکے ماندے اور ہجر زدہ عاشق کے مقابلے میں زیادہ توانا اور مردانہ محسوس ہوتا ہے۔" یہ کس کا قول ہے؟

(الف) خلیل الرحمن اعظمی (ب) مخمور جالندھری

(ج) خلیق انجم (د) ندا فاضلی

(16) "اور بستی نہیں یہ دلی ہے" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) منظر سلیم (ب) رفعت سروش

(ج) زبیر رضوی (د) ندا فاضلی

(17) اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

قتیل شفائی کے اس شعر کی تحریف کس شاعر نے اس طور پر کی ہے؟

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز قتیل شفائی کی

(الف) باقر مہدی (ب) منیر نیازی

(ج) سلیم احمد (د) احمد فراز

(18) "گردش پا" کس کی خودنوشت ہے؟

(الف) رفعت سروش (ب) زبیر رضوی

(ج) ملک زادہ منظور احمد (د) کمار پاشی

(19) معروف شاعر اسرار الحق مجاز کے حالات زندگی پر مبنی ناول "غم دل وحشتِ دل" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) اسرار الحق مجاز (ب) علی سردار جعفری

(ج) محمد حسن (د) قمر رئیس

(20) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" کس کی تصنیف ہے۔

(الف) لطف الرحمن (ب) مظفر حنفی

(ج) عمیق حنفی (د) شمیم حنفی

(21) "اردو کا ابتدائی زمانہ" کس کی تحقیقی کاوش ہے؟

(الف) عصمت جاوید (ب) عطش درانی

(ج) عبدالستار دلوی (د) شمس الرحمن فاروقی

(22) اردو املا کو سہل اور سائنٹفک بنانے میں اہم رول رہا ہے......

(الف) رشید حسن خاں کا (ب) گوپی چند نارنگ کا

(ج) عبدالستار صدیقی کا (د) تینوں کا

(23) "مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) قمر رئیس (ب) ابوالکلام قاسمی

(ج) گوپی چند نارنگ (د) عتیق اللہ

(24) کتاب "آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید" کس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے؟

(الف) شارب ردولوی (ب) نثار احمد فاروقی

(ج) قمر رئیس (د) عنوان چشتی

(25) ہندوستان میں اس وقت اردو پروفیسر ایمریٹس کا اعزاز صرف تین شخصیات کے پاس ہے۔ ان کے نام ہیں......

(الف) پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر مسعود حسین خاں

(ب) پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر سید عقیل رضوی اور پروفیسر عتیق اللہ

(ج) پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر محمد حسن

(د) پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر گوپی چند نارنگ

(26) "بیسویں صدی میں طنز و مزاح" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) یوسف ناظم (ب) مجتبیٰ حسین

(ج) مظہر احمد (د) نامی انصاری

(27) “دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات” کس کا انشائیہ ہے؟

(الف) مجتبیٰ حسین (ب) یوسف ناظم
(ج) مشتاق احمد یوسفی (د) کرنل محمد خاں

(28) “آب گم” کس کی تصنیف ہے؟

(الف) یوسف ناظم (ب) مجتبیٰ حسین
(ج) نصرت ظہیر (د) مشتاق احمد یوسفی

(29) ناول “آگ کا دریا” پہلی بار کب منظر عام پر آیا؟

(الف) 1951 میں (ب) 1954 میں
(ج) 1958 میں (د) 1959 میں

(30) “دوگز زمین” کس کا ناول ہے؟

(الف) شموئل احمد (ب) عبدالصمد
(ج) پیغام آفاقی (د) سید محمد اشرف

(31) ذیل میں کون سا ناول اگرچہ اردو میں لکھا گیا لیکن پہلی بار ہندی رسم خط میں شائع ہوا؟

(الف) وش منتھن (ب) کتنے پاکستان
(ج) دویہ بانی (د) آدھا گاؤں

(32) سلام بن رزاق کے کس افسانوی مجموعے کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ پیش کیا گیا ہے؟

(الف) ننگی دوپہر کا سپاہی (ب) معبّر
(ج) کام دھینو (د) شکستہ بتوں کے درمیاں

(33) “مرثیے کی سماجیات” کس کی تنقیدی کاوش ہے؟

(الف) شارب ردولوی (ب) نیر مسعود
(ج) سید عقیل رضوی (د) ہلال نقوی

(34) “بیسویں صدی اور جدید مرثیہ” کو ناقدین نے جدید اردو مرثیے کا انسائیکلوپیڈیا قرار دیا ہے۔ یہ کس کی تصنیف ہے؟

(الف) ہلال نقوی (ب) ضمیر اختر نقوی
(ج) محمد رضا کاظمی (د) تقی علی عابدی

(35) ممتاز شاعر نشتر خانقاہی کے آخری مجموعۂ کلام کا نام کیا ہے؟

(الف) منظر پس منظر (ب) معلوم نامعلوم
(ج) سرائے میں شام (د) دسترس

(36) “اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب” کس کی تصنیف ہے؟

(الف) گوپی چند نارنگ (ب) مظفر حنفی
(ج) اختر انصاری (د) رشید حسن خاں

(37) “ڈار سے بچھڑے” کس کا افسانوی مجموعہ ہے؟

(الف) سید محمد اشرف (ب) مشرف عالم ذوقی
(ج) علی امام نقوی (د) غضنفر

(38) “تین بتی کے راما” کس کا ناول ہے؟

(الف) راہی معصوم رضا (ب) علی امام نقوی
(ج) اقبال مجید (د) الیاس احمد گدی

(39) ذیل میں کون فن کار سب سے زیادہ تجریدی افسانہ نگاری کے لیے مشہور ہے؟

(الف) انتظار حسین (ب) بلراج مینرا
(ج) دیوندر اسر (د) انور سجاد

(40) اب تک اردو کے جن تین فن کاروں کو گیان پیٹھ ایوارڈ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے نام کیا ہیں؟

(الف) فراق گورکھ پوری، علی سردار جعفری اور عصمت چغتائی
(ب) قرۃ العین حیدر، فراق گورکھ پوری اور اختر الایمان
(ج) علی سردار جعفری، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر
(د) فراق گورکھ پوری، قرۃ العین حیدر اور علی سردار جعفری

(41) ذیل کے کس پاکستانی محقق نے یگانہ چنگیزی کی کلیات مرتب کی ہے؟

(الف) جمیل جالبی (ب) محمود واجد
(ج) مشفق خواجہ (د) عطش درانی

(42) “بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب” کس کی کتاب ہے؟

(الف) عتیق اللہ (ب) شمیم حنفی
(ج) قمر رئیس (د) اسلم پرویز

(43) دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے
یہ شعر کس کا ہے؟

(الف) شہریار　(ب) عادل منصوری
(ج) بشیر بدر　(د) جاں نثار اختر

(44) ذیل میں سے کون سی کتاب وہاب اشرفی کی ہے؟

(الف) تاریخ ادبیات عالم　(ب) اقبال اور عالمی ادب
(ج) عالمی ادب　(د) ادبیات عالم

(45) حبیب تنویر کا اصل نام کیا ہے؟

(الف) حسیب احمد خاں　(ب) حبیب احمد خاں
(ج) حسیب محمد خاں　(د) حبیب محمد خاں

(46) شان الحق حقی کو ادب کے کس شعبے میں زیادہ شہرت حاصل ہے؟

(الف) شاعری　(ب) تنقید
(ج) تحقیق　(د) لغت نویسی

(47) 2005 کا قطر عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کس ہندوستانی مصنف کو پیش کیا گیا؟

(الف) جوگیندر پال　(ب) قرۃ العین حیدر
(ج) جیلانی بانو　(د) قاضی عبدالستار

(48) "عمر گذشتہ کا حساب" کس کا شعری انتخاب ہے؟

(الف) مخمور سعیدی　(ب) کمار پاشی
(ج) بانی　(د) خلیل الرحمن اعظمی

(49) "شاعری مسرت سے شروع ہو کر بصیرت پر ختم ہوتی ہے" یہ کس ناقد کا قول ہے؟

(الف) وزیر آغا　(ب) احتشام حسین
(ج) کلیم الدین احمد　(د) آل احمد سرور

(50) اردو صحافت کے موضوع پر "ابلاغیات" حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے جو طلبہ میں کافی مقبول ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کون ہیں؟

(الف) دیویندر اسر　(ب) کمال احمد صدیقی
(ج) محمد شاہد حسین　(د) انجم عثمانی

□□□

ہمیں مارچ کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. درخشاں زریں
بنت جناب محمد ابونصر ظہیری
محلہ عماد پور، بہار شریف
ضلع نالندہ۔ 803101 (بہار)

2. سیمیں فاطمہ
حلیم چک، رفیع گنج
ضلع اورنگ آباد، 824125 (بہار)

3. محسنہ ریاض
18۔ سید شفیع اسٹریٹ
بشیر آباد، مسلم پور، وانیم باڑی
ضلع ویلور۔ 635751 (تمل ناڈو)

انعام یافتگان کو ادارے کی جانب سے مبارکباد۔
آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کر دیے جائیں گے۔

(ادارہ)

مارچ انعامی مقابلہ (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. ج　2. الف　3. الف　4. د　5. الف
6. د　7. الف　8. ج　9. الف　10. ب
11. ب　12. الف　13. ب　14. ج　15. الف
16. الف　17. ج　18. الف　19. ب　20. ج
21. الف　22. الف　23. د　24. الف　25. ب
26. الف　27. الف　28. ج　29. الف　30. ج
31. الف　32. الف　33. الف　34. ب　35. ب
36. ج　37. الف　38. الف

ارشاد حسین فاروقی

کمپیوٹر سنٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔33

بڑھتے قدم

اسرار احمد رازی نے ابتدائی تعلیم قاسم العلوم باغ نگر، تعلیم الاسلام اونچھرہ اور دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں حاصل کی۔ اس کے بعد ریاض العلوم جونپور اور دارالعلوم دیوبند سے 92-91 میں فضیلت کی سندحاصل کی بعد ازاں قومی کونسل برائے فروغ کردو زبان کے ایک سالہ ڈپلومہ ان کمپیوٹر ایپلیکیشنز اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ میں 2001-02 کے بیچ میں غالب اکیڈمی مرکز سے یہ کورس مکمل کیا۔ ارشاد حسین فاروقی اسی کورس کی بنیاد پر آج برسر روزگار ہیں۔ ان سے کی گئی گفتگو کے چند اقتباسات قارئین 'اردو دنیا' کے لیے پیش ہیں۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: ادارہ نئی دنیا میرے ملازمت اختیار کرنے سے بہت پہلے ہی کمپیوٹر تکنیک سے آراستہ ہو چکا تھا اور اس تکنیک کی روز افزوں ترقی سے اس تکنیک کو سیکھنے کا ذوق پیدا ہوا اور بالآخر قومی اردو کونسل کے تعاون سے یہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے سینٹر کمپیوٹر تعلیم میں اردو پیکج پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اس لیے وہ دوسرے سینٹروں سے ممتاز ہیں۔ ان سینٹروں کو اس لیے بھی فوقیت حاصل ہے کہ وہ طلبہ کو نہایت علمی ماحول میں مناسب اور معیاری تعلیم وتربیت فراہم کرتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جا رہی ہے، اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جا رہی ہے، وہ اپنی جگہ پر مکمل اور قابل اطمینان ہے۔ طلبہ سے میری یہ گزارش ضرور ہے کہ وہ پریکٹیکل پر خصوصی توجہ دیں تا کہ عملی طور پر انھیں اس میدان میں کوئی دقت درپیش نہ آئے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کا یہ پروگرام اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرنے میں کافی حد تک معاون ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: بڑی مسرت ہوتی ہے، کیوں کہ آج کل انفارمیشن ٹیکنالوجی تقریباً تمام شعبہ ہائے حیات کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا عمل دخل آج ہر جگہ نظر آ رہا ہے چاہے وہ سماجی، سیاسی، تعلیمی، زندگی ہو یا پھر معاشی اور تجارتی حتی کہ آج گھریلو زندگی میں بھی انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ایک اہم مقام ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب بڑی بڑی ڈگریوں کے باوجود انفارمیشن ٹیکنالوجی سے نابلد شخص کو ناخواندہ اور ملازمت کے لیے نااہل تصور کیا جائے گا۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: بلاشبہ اس کورس کی تکمیل کے بعد میری خود اعتمادی اور خود انحصاری میں بدلاؤ آیا ہے جس کے لیے میں قومی اردو کونسل کا شکر گزار ہوں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: اس بنیاد پر متلاشی روزگار کو ترجیحی مقام حاصل رہتا ہے۔ اگر کسی خالی اسامی کے لیے کئی امیدوار ہوتے ہیں تو یہ خصوصیت وجہِ ترجیح ثابت ہوتی ہے اور امیدوار کا انتخاب ترجیحی بنیاد پر ہو جاتا ہے۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہیں تھی؟

جواب: قومی اردو کونسل کے اس کورس کے لیے جو فیس دی جاتی ہے وہ قابل برداشت ہے، دوسرے یہ کہ غریبوں اور ناداروں کو اس میں رعایت بھی دی جاتی ہے اس لیے اس کورس کو کرنے کے لیے بہت زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، پہلی فرصت میں ہر طالب علم کو اس کورس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔

□□□

اردو خبر نامہ

''فروغ اردو کے لیے نئی حکمت عملی'' کانفرنس

● دربھنگہ، 20 فروری۔ مرکزی وزیر ریلوے جناب لالو پرساد یادو نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ملت کالج، دربھنگہ میں منعقدہ تین روزہ قومی اردو کانفرنس ''فروغ اردو کے لیے نئی حکمت عملی'' کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ میں ہندی اور اردو کو جڑواں بہن کی طرح سمجھتا ہوں۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ کلچر کی زبان ہے اس کو کسی مذہب سے جوڑ کر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی میں اس زبان نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دے کر اس تحریک میں جان ڈالی تھی۔ اس لیے اس زبان کو کسی خاص مذہب سے جوڑ کر دیکھنے والے تنگ نظر ہیں اور ایسا سوچنا ملک کی سیاست اور قومی یکجہتی کے لیے خطرناک ہے۔ لالو پرساد یادو نے کہا کہ متحدہ ترقی پسند اتحاد حکومت نے اردو کو فروغ دینے کے لیے اہم فیصلے کیے ہیں۔ اس سلسلے میں سروے کا کام کیا جا رہا ہے اور اعداد و شمار مہیا کیے جا رہے ہیں کہ اردو آبادی کا کتنا فیصد حصہ مختلف سرکاری اور نجی اداروں میں روزگار سے وابستہ ہے۔ انھوں نے اردو عوام کو یقین دلایا کہ اس تین روزہ کانفرنس میں اردو کے فروغ و ترویج کے لیے جو سفارشیں اور قرار دادیں ابھر کر سامنے آئیں گی ان کو میں مرکز اور ریاستی حکومتوں کے ذریعے عمل میں لانے کی کوشش کروں گا۔

محمد علی اشرف فاطمی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کا کام ہماری حکومت میں جس قدر ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس سلسلے کی ایک کامیاب کڑی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام چلائے جانے والے کمپیوٹر مراکز ہیں اور انھوں نے اس اسکیم کو مزید مستحکم کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں مدرسوں کے فارغ طلبہ کو مدرسوں اور مسجدوں تک محدود نہیں رکھنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں جدید علوم و فنون سے آراستہ کیا جائے تاکہ اردو آبادی روزی روٹی سے وابستہ ہو سکے اور زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہے۔

جلسے کی نظامت ڈاکٹر آر. کے. بھٹ پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کی اور کونسل کی سرگرمیوں کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا تاکہ عوام و خواص کونسل کی جانب سے جاری اردو کے مختلف پروگراموں سے متعارف ہو سکیں۔

محبوب احمد خاں، رام نواس پرساد، پیتامبر پاسوان، للت یادو، ہری نندن یادو، ہری کشن یادو، اور مصری لال یادو وغیرہ نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ یہ افتتاحی تقریب قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر انچارج ایس. موہن کے اظہار تشکر پر اختتام پذیر ہوئی۔

کانفرنس کے دوسرے دن پہلا اجلاس'' مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی لسانی پالیسی اور اردو'' کے موضوع پر ہوا جس کی صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر اظہار احمد، پروفیسر رئیس انور اور پروفیسر قمر جہاں نے کی اور پروفیسر محفوظ الحسن، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر ایم. اے. قریشی، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، ایس. ایم. اشرف فرید، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر آفتاف احمد آفاقی، آفتاب جیلانی، ڈاکٹر شاہد رزمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، نسیم فاروقی، پروفیسر عبدالمنان طرزی، اور پروفیسر طیب صدیقی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔

دوسرا اجلاس'' اردو کی ترقی میں سرکاری، نیم سرکاری اور رضا کار تنظیموں کا کردار'' کے موضوع پر ہوا جس کی صدارت سید شاہ نور الحق قادری، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق اور پروفیسر چودھری محمود عالم نے کی اور پروفیسر رئیس انور، پروفیسر قمر جہاں، مشتاق احمد نوری، شہزاد انجم، ابوذر ہاشمی، ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر عبید الرحمٰن، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر احتشام الدین اور عطا عابدی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر شام سات بجے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن نے کی اور پروفیسر شاکر خلیق نے نظامت کی۔ اس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے شعرائے کرام خصوصاً جناب مخمور سعیدی، جناب حیات لکھنوی، جناب عالم خورشید، جناب اویس احمد دوراں، جناب علاء الدین حیدر وارثی، جناب منصور عمر، محترمہ سنیتا رینا، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، جناب اقبال اشہر، ڈاکٹر نور محمد، جناب محمود بھارتی وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے میں جناب محمد علی اشرف فاطمی جناب اخلاق احمد، جناب للت کمار یادو، جناب

ہری نندن یادو، جناب ہری کرشن یادو اور جناب سلطان احمد خاص طور سے موجود تھے۔

کانفرنس کے تیسرے دن تیسرا اجلاس جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے مدرسوں کے ذریعہ اٹھائے گئے اقدامات پر ہوا جس کی صدارت پروفیسر یونس حکیم، ڈاکٹر عبدالعزیز سلفی، اور پروفیسر عبدالصمد نے کی اور مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، ڈاکٹر ایس.ایم رضوان اللہ، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر عالم گیر شبنم، جناب عطا عابدی، جناب شکیل احمد سلفی، ڈاکٹر منظر سلیمان اور ڈاکٹر توقیر احمد راہی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس کی نظامت پروفیسر شمیم باروی نے کی۔ پروفیسر عبدالصمد نے کہا کہ مدارس کی تعلیم میں مذہبی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اطلاعاتی اور ٹیکنالوجی تعلیم کو اپنانے کی ضرورت ہے، کیونکہ مدارس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہاں سے صرف دینی تعلیم حاصل کرنے والے دیگر علوم سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے دوسرے شعبوں میں انھیں روزگار نہیں مل پاتا۔ انھوں نے کہا کہ اگر مدارس میں جدید تعلیم کا فروغ ہوا تو روزگار کے مواقع بھی مدارس کے فارغین کو حاصل ہوں گے۔ ڈاکٹر توقیر احمد راہی نے مدارس کے مسائل اور جدید تقاضوں پر روشنی ڈالی اور سرکاری اسکیموں سے واقف کرایا۔

مرکزی وزیر مملکت جناب محمد علی اشرف فاطمی نے کہا کہ اردو کے مسائل کا حل کیسے ہو اور مدارس کے فارغین کو روزی روٹی کیسے مل سکے اس پر حکومت سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا محکمہ بالخصوص قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جدید تکنیکی تعلیم مثلاً آئی.ٹی.آئی، پالی ٹکنیک، عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ، میڈیکل کی نصابی کتابوں کو اردو میں شائع کرنے پر توجہ دے رہی ہے۔ جیسا کہ آج 18 پیشہ وارانہ کورس کی کتابوں کا اجرا کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو بلا تفریق مذہب اپنایا جائے اور اسے روزی روٹی سے جوڑا جائے۔ مہمان خصوصی جناب ورشن پٹیل، وزیر تعلیم بہار نے کہا کہ اردو اگر مرگئی تو ملک مرجائے گا کیوں کہ اردو ہندوستان کی تہذیبی زبان ہے اس کی زندگی سے ہی ہندوستان کی شناخت ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے وائس چانسلر پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو یونیورسٹی ملک گیر پیمانے پر اردو کی تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پیشہ وارانہ تعلیم کو شہر سے دیہات تک لے جانے کی کوشش کر رہی ہے جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا تعاون حاصل ہے۔ اختتامی جلسے میں سابق وزیر پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر اشفاق انصاری، جناب شیو ناتھ ورما موجود تھے جب کہ ممبر کونسل ڈاکٹر تنویر حسن اور جناب سنجے سراوگی (ایم.ایل.اے) نے بھی اظہار خیال کیا۔ جلسے میں سابق ممبر اسمبلی جناب سلطان احمد، جناب ممتاز عالم ایڈووکیٹ، پروفیسر ایس.ایم. جاوید اقبال، پروفیسر ی.ایم.عالم پرنسپل ملت کالج اور ڈاکٹر ندیم احمد نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد مدیر ''جہانِ اردو'' دربھنگہ نے سہ روزہ کانفرنس کی روداد پیش کی اور شرکائے کانفرنس کی جانب سے پیش کیے گئے نکات کو جلسۂ عام بالخصوص وزیر تعلیم کے سامنے رکھا اور یہ مطالبہ کیا کہ حکومت ان تجاویز کو عملی جامہ پہنائے تاکہ اردو کے کاز کو تقویت مل سکے۔ جلسے کی نظامت قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر آر.کے. بھٹ نے کی۔ انھوں نے اپنی استقبالیہ تقریر میں اس کانفرنس کی کامیابی پر اظہار تشکر کیا اور تمام مندوبین اور مقامی افراد کا شکریہ ادا کیا کہ ان کے تعاون سے یہ قومی کانفرنس کامیاب رہی۔

ریاستی اردو اکادمیوں کی پانچویں کانفرنس

● چنڈی گڑھ، 4 مارچ۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے بہ اشتراک ہریانہ اردو اکادمی، پنجاب یونیورسٹی کے آئی سی.ایس.ایس.آر ہال میں 3 تا 4 مارچ کو ریاستی اردو اکادمیوں کی پانچویں کانفرنس کا افتتاح عزت مآب ڈاکٹر اے.آر. قدوائی، گورنر ہریانہ نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو ہندوستان میں اپنی تاریخی خدمات کی وجہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اردو زبان و ادب کے تئیں لوگوں کی دلچسپی روز بہ روز بڑھے۔ اس کے لیے اردو شاعروں بالخصوص میر، غالب اور اقبال وغیرہ کے ذو لسانی (اردو اور ہندی) پاکٹ سائز ایڈیشن شائع کرنا چاہیے تاکہ ہندوستان کا ایک بڑا طبقہ جو اردو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا ہے، استفادہ کر سکے۔ اس جلسے کے مہمانِ خصوصی عالی جناب پھول چند ملانا، وزیر تعلیم ہریانہ نے کہا کہ اردو عام آدمی کی زبان ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی ترویج و ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ زندہ زبان وہ ہے جس کی لفظیات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسے نئے الفاظ کی نشاندہی کرنی چاہیے اور زبانوں کے بدلتے ہوئے ایسے رویے کا احتساب بھی، تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ عہدِ حاضر کی زبان ماضی کی زبان سے کتنی مختلف ہے۔ اردو میں زبان کی سطح پر، لفظ کی سطح پر اور تلفظ کی سطح پر جو تبدیلیاں آرہی ہیں ان سے ہمیں اجنبیت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے قبل جناب آر ایس گجرال (آئی.اے.ایس)،

فنانشل کمشنر اور سکریٹری (معتمد) برائے تعلیم ہریانہ نے کانفرنس میں آئے ہوئے تمام مندوبین کا استقبال کیا۔ ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور تمام حضرات کا خیر مقدم کیا۔ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے اظہار تشکر سے قبل قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ ریاستی اردو اکادمیوں کی کانفرنس کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور تمام ریاستی اردو اکادمیوں کے مابین باہمی رابطے کو مضبوط کرنے کی غرض سے نئی حکمت عملی کو وضع کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ تمام اردو اکادمیاں اپنی اپنی ریاستوں میں اردو زبان کے فروغ، ترویج و ترقی اور حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کے نفاذ کے لیے، قومی اردو کونسل کی ریاستی شاخ کے طور پر کردار ادا کرسکیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس میں اردو اکادمیوں اور قومی اردو کونسل کے مابین روابط کی نئی جہات متعین ہوں گی اور ان کی روشنی میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف اقدام دونوں جانب سے کیے جاسکتے ہیں۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت جناب سید ذاکر حسین سربراہ مغربی بنگال اردو اکادمی، جناب کشمیری لال ذاکر، اور ڈاکٹر آر. کے. بھٹ، نے کی جس میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اخلاق اسلام، دہلی اردو اکادمی کے نمائندے کی حیثیت سے جناب انیس اعظمی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری محترمہ شاہ جہاں غنی نے اپنی اپنی اکادمیوں کی روداد پیش کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت اتر پردیش اردو اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر محمد لیسین عثمانی، ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر اور ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے کی جس میں اڑیسہ اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر لیاقت علی، تمل ناڈو اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کے. ایم. اشفاق الرحمن اور اتر پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری جناب محمد نجم الحسن نے اپنی اپنی اکادمیوں کی کارگزاریاں پیش کیں۔ 4 مارچ کو کانفرنس کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت جناب سید ذاکر حسین، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، جناب کشمیری لال ذاکر، اور ڈاکٹر آر. کے. بھٹ، نے کی اور ہماچل پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری جناب سدرشن وششٹھ اور جموں و کشمیر اردو اکادمی کے نمائندے کی حیثیت سے جناب محمد اشرف ٹاک اور کرناٹک اردو اکادمی کے صدر جناب ن. م. سعید نے رپورٹیں پیش کیں۔

کانفرنس کے اختتام پر ریاستی اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی کی تشکیل نو کی گئی اور اس کا صدر ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری، جناب کشمیری لال ذاکر کو منتخب کیا گیا جب کہ اتر پردیش اردو اکادمی، کرناٹک اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سکریٹریوں کو بطور ممبر چنا گیا۔ اردو اکادمیوں کی یہ رابطہ کمیٹی وقتاً فوقتاً ملتی رہے گی اور کانفرنس کے دوران منظور کی گئی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے میں ریاستی اردو اکادمیوں اور کونسل کے درمیان ایک پل کا کام کرے گی۔

ریاستی اردو اکادمیوں کی اس دو روزہ کانفرنس میں مختلف اکادمیوں کے مندوبین حضرات کی بحث و تمحیص کے نتیجے میں متفقہ طور پر جو سفارشیں اور قراردادیں ابھر کر سامنے آئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1. قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اراکین کو چاہیے کہ وہ اکادمیوں کے مسائل کو حل کرنے اور فروغ اردو کی سرگرمیوں میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اکادمیوں کا دورہ کریں۔
2. ریاستی اردو اکادمیوں کی یہ کانفرنس مختلف ریاستوں میں ہر سال ہونی چاہیے۔ اس نوع کی چھٹی کانفرنس کرناٹک اردو اکادمی کے اشتراک سے بنگلور میں منعقد کی جاسکتی ہے۔
3. گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق تمام ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہونی چاہئیں اور ہر ریاست میں سہ لسانی فارمولے پر عمل آوری کے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔
4. گجرات اور راجستھان میں اردو اکادمیاں فی الحال معرض التوا میں ہیں، ان کو بحال کرنا چاہیے۔
5. جن ریاستوں کی اردو اکادمیوں کے صدر/چیرمین/سکریٹری کی مدت کار متعین نہیں ہے اسے کم از کم تین برس کی مدت تک متعین ہونا چاہیے۔
6. قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاستی اردو اکادمیوں کے کردار کو واضح طور پر متعین ہونا چاہیے۔
7. مرکزی حکومت کو اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ایک آئینی کمیشن (Statutory Commission) دوسرے قومی کمیشنوں کے خطوط پر قائم کرنا چاہیے اور اس کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اردو کاز کے لیے اپنے فیصلے اور سفارشات کو نافذ کرا سکے۔
8. ریاستی اردو اکادمیوں کے مابین پروگراموں کا لین دین مسلسل جاری رہنا چاہیے۔

فلمی دنیا اور اردو کے رشتوں پر مباحثہ

● ممبئی، 15 فروری۔ فلمی دنیا سے اردو زبان کا رشتہ کب سے ہے اور س رشتے کے پیچ وخم کیا ہیں؟ کیا یہ رشتہ ہمیشہ رہے گا یا پھر نئی نسل کا مغربی کلچر سے لگاؤ فلموں سے اردو کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟ ان سوالات کو لے کر بی بی سی اردو ڈاٹ کام کی جانب سے ممبئی میں ایک مباحثے کا انعقاد کیا گیا جس میں فلمی دنیا کے کئی نامور اسکرپٹ رائٹر، مکالمہ نویسوں اور نغمہ نگاروں نے شرکت کی۔ مباحثے کی میزبانی بی بی سی اردو کے مہر زیدی اور عالیہ ناز نے کی۔ اس میں فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' اور ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے اسکرپٹ رائٹر جاوید صدیقی، فلم ''نکاح'' اور ''سلسلہ'' کے نغمہ نگار اور کئی فلموں کے مکالمہ نویس اور صحافی حسن کمال، تھیٹر فنکار اور فلم ''بھگت سنگھ'' کے علاوہ کئی فلموں کے اسکرپٹ رائٹر پیوش مشرا اور فلم ''پرندہ'' اور ''واستو'' کے کہانی نویس امتیاز حسین نے شرکت کی۔

مباحثے میں جاوید صدیقی نے فلموں کے لیے لفظ ''بالی وڈ'' پر اعتراض کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ لفظ اردو میں بہت غلط طریقے سے گھس آیا ہے۔ فلموں میں اردو زبان کے بارے میں انھوں نے کہا کہ فلم کی کوئی زبان نہیں ہوتی بلکہ کردار اپنی زبان بولتا ہے۔ فلم شطرنج کے کھلاڑی جس دور کی فلم تھی اس میں بحیثیت اسکرپٹ رائٹر انھوں نے فارسی اور اردو کے الفاظ استعمال کیے جب کہ ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں انھوں نے ہلکی پھلکی زبان کا تعمال کیا کیونکہ یہ ان کے کرداروں کا تقاضا تھا، البتہ فلموں میں نغموں کی ن کو اردو کہا جا سکتا ہے۔ جاوید صدیقی نے اعتراف کیا کہ زمانے کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسکرپٹ رائٹر کام کرتا ہے اس لیے فلم ''یہ دل مانگے مور'' کے مکالے انھوں نے آدھے انگریزی اور آدھے اردو میں لکھے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ فلموں میں اردو آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اردو محبت، جذبات اور رابطے کی عام فہم زبان ہے۔

پیوش مشرا نے کہا کہ اردو ایک بہت آسان لیکن بہت دل موہ لینے والی زبان ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وقت کے ساتھ زبان میں تبدیلی آئی ہے۔ انھوں نے اردو کے مشہور شاعر مجروح سلطان پوری کی مثال دی کہ انھوں نے لم ''دل دے چکے صنم'' میں کس طرح زبان کے ساتھ سمجھوتہ کیا۔ تاہم پیوش مشرا نے کہا کہ فلموں کی زبان ہندوستانی ہے۔

حسن کمال کا کہنا تھا کہ فلم کی زبان ہمیشہ سے اردو ہی رہی ہے لیکن اب حالات بدل رہے ہیں کیونکہ اب مادری زبان کی جگہ انگریزی نے لے لی ہے اور مادری زبانیں صرف گھروں میں خادموں یا پھیری والوں سے بات کرنے کی حد تک محدود ہو گئی ہیں۔ حسن کمال نے کہا کہ اب دو طرح کی فلمیں بن رہی ہیں ایک کا کلچر ملٹی پلیکس تھیٹرز کے لیے ہے اور دوسری بھوجپوری یا دیگر زبان کی فلمیں۔ امتیاز حسین کے مطابق، پرانے دور کی فلموں میں جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ اب بہت حد تک بدل چکی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ زبانیں بدلتی ہیں۔

دوران مباحثہ ایک مکالمہ نویس یا کہانی نویس کی حدود کی بات بھی ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ کہانی یا مکالمہ نویس کو کس حد تک زبان کے استعمال میں چھوٹ ملنی چاہیے اور یہ حد کون مقرر کرے گا؟ حاضرین نے پینل کے شرکا سے سوالات کیے۔ انھوں نے پوچھا کہ فلموں میں اردو زبان کے استعمال کے باوجود فلمساز ہندی کا سرٹیفکیٹ کیوں لیتے ہیں؟ پینل کے ارکان نے جواب میں کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں فلم فیئر ایوارڈ دینے والوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ صرف انھی فلموں کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا جائے گا جو ہندی کی ہوں گی۔

(''قومی آواز''، دہلی)

سیمینار ''غالب کی نثر اور ان کے عہد کے اہم نثر نگار''

● نئی دہلی۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی کی طرف سے ''غالب کی نثر اور ان کے اہم نثر نگار'' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے کی اور نظامت شاہینہ تبسم نے کی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے سیمینار میں ''غالب کی صدی، محمد حسین آزاد اور نشاۃ ثانیہ کا مسئلہ'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ ہماری اجتماعی تاریخ میں یہ دور غیر معمولی واقعات اور غیر معمولی شخصیتوں کا دور تھا۔ سرسید، حالی، شبلی، نذیر، ذکاء اللہ، غالب اور صہبائی سب کے سب اسی عہد کے افق پر نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر اوصاف احمد نے ''خطوط غالب اور جدید اردو نثر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اپنے مقالے ''سرسید کا اسلوب نثر'' میں کہا کہ سرسید نے اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر تجزیاتی اور استدلالی اسلوب اظہار کو مکالمے اور خود کلامی کے لہجے سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے مقالے ''خطوط غالب کی نثر'' میں کہا کہ غالب کے نثری اسلوب بیان کا حقیقی حسن یہ ہے کہ خیال کے ساتھ ساتھ احساس کا موج تہ نشیں بھی سرگرم عمل ہے۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے ''ڈپٹی نذیر احمد ایک صاحب طرز نثر نگار'' ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ''غالب کی

نثر چند گزارشات'' اور ڈاکٹر محمد فیروز نے '' غالب کے خطوط بنام مہدی مجروح'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس میں پروفیسر قمر رئیس نے '' غالب کی نثر میں طنز و مزاح'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ حقائق کے عنوان سے شوخی پیدا کرتے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر اصغر عباس نے '' حالی کی مذہبی تصانیف چند معروضات کی روشنی میں'' پروفیسر شمس الحق عثانی نے '' کچھ نثر حالی کے بارے میں'' کے عنوان سے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی نظامت سرور الہدیٰ نے کی۔ جناب سید اوصاف علی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ طرز ہی ادیب کو ممتاز بناتا ہے۔ سادہ زبان زیادہ موثر ہے، یہ بات تمام زبانوں میں تسلیم کی گئی ہے۔ آخر میں اکیڈمی کے صدر خواجہ حسن ثانی نظامی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر منیر انجم کی کتاب '' دفتری طریقۂ کار'' کی رونمائی جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے کی۔ (ڈاک سے)

یومِ غالب کا انعقاد

● دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے بہ تعاون غالب انسٹی ٹیوٹ مزارِ غالب پر '' یومِ غالب'' کے عنوان سے منعقدہ جلسے میں صدارتی تقریر میں ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اردو زبان و ادب کو بین الاقوامی سطح پر زندہ رکھنے میں غالب کے شعری سرمائے کا اہم رول ہے۔ انھوں نے دلّی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ بارکھمبا میٹرو اسٹیشن کا نام مرزا غالب کے نام سے منسوب کیا جائے اور دلّی اسمبلی اور سکریٹریٹ میں غالب کی تصویر لگائی جائے۔ تقریب کے آغاز میں بزرگ شاعر گلزار دہلوی نے یومِ غالب کی تقاریب کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب ایک ایسا شاعر ہے جو زندگی کے ہر راستے میں مل جاتا ہے اور ہمارے کسی نہ کسی تجربے سے غالب کا رشتہ ضرور جڑتا نظر آتا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب کی شاعری برے سے برے حالات میں لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے اور جدو جہد کی راہ دکھاتی ہے اور یہ غالب ہی کی شاعری کا نتیجہ ہے کہ باہری دنیا کے لوگ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور اردو زبان کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شریف الحسن نقوی نے کہا کہ اردو زبان کے ذریعے ہم نے غالب کو پہچانا ہے اور ان کے اشعار کو سمجھا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس زبان کو کس طرح زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ غالب کو ہماری طرف سے صحیح خراجِ عقیدت یہی ہوگا کہ ہم اردو تعلیم کو فروغ دیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ اس تقریب کی نظامت غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے کی بعد ازاں غالب کی زمین میں ایک طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی اور نظامت شکیل حسن شمسی نے شعرا نے غالب کی زمین میں اشعار پیش کیے۔ (ڈاک سے)

ولی اورنگ آبادی کی 281 ویں برسی

● اورنگ آباد۔ فخر دکن ولی اورنگ آبادی کی 281 ویں برسی بتاریخ 18 محرم الحرام بمطابق 17 فروری کو درگاہ حضرت خدا نما احمد شاہ گجراتیؒ واقع کالی باؤلی، میں منائی گئی۔ ولی اورنگ آبادی کی برسی کا اہتمام محمود الرحمٰن (چیئر مین طلعت ایجوکیشن سوسائٹی) نے کیا تھا، یہ تقریب خاندانِ سجادگان درگاہ مذکور اور مراٹھواڑہ مجاور جماعت سنگھ اور ترقی اردو اورنگ آباد کے مشترکہ تعاون سے منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر مظہر محی الدین سابق پرنسپل مولانا آزاد کالج، پروفیسر فاروق محمد خاں، ڈاکٹر محبوب شریف، ڈاکٹر مرتضیٰ، مراٹھواڑہ مجاور سنگھ کے صدر سلیم مولی، انجمنِ ترقی اردو مراٹھواڑہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر میر مجاہد علی، مورخ دکن و سوانح نگار ولی، مرزا آغا بیگ، محمد خاں، خالد احمد، صابر خان اور بزم روشن خیال کے جنرل سکریٹری ارشد اورنگ آبادی، جعفر سوز، مظہر نظامی پیرزادہ، رفعت شطاری، یونس خاں قادری، آصف ہاشمی، احمد اللہ خاں، معین بھائی فوٹوگرافر، شارق نقشبندی، شکیل احمد درویش اور ناظم صوفی وغیرہ موجود تھے۔ (ڈاک سے)

کلیات پر قومی سیمینار

● علی گڑھ، 4 دسمبر۔ شعبۂ کلیات اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 3 اور 4 دسمبر 2005 کو کلیات پر دو روزہ قومی سیمینار منعقد ہوا جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے کی۔ پروفیسر انیس احمد انصاری مشیر (یونانی) شعبہ آیوش وزارتِ صحت و خاندانی بہبود مہمان خصوصی تھے اور حکیم محمد خالد صدیقی ڈائرکٹر سی۔سی۔آر۔یو۔ایم مہمان اعزازی تھے۔ افتتاحی اجلاس میں مشہور صنعت کار جناب ظفر عالم نے بھی خطاب کیا۔ خطبۂ استقبالیہ پروفیسر حکیم خالد زماں خاں، ڈین و صدر شعبۂ کلیات نے پیش کیا۔ سیمینار کے افتتاحی اور اختتامی اجلاس کی نظامت جناب ڈاکٹر فواد سعید شیرانی نے کی۔

سیمینار میں ڈیڑھ سو مندوبین نے شرکت کی اور اپنے مقالات پیش کیے۔ سیمینار کے اٹھارہ اجلاس ہوئے جن کی صدارت ملک کے مایہ ناز اطبا نے کی جن میں چند اہم نام یہ ہیں۔ پروفیسر اقتدار الحسن زیدی، پروفیسر

کے. ایم. وائی. امین، پروفیسر ایس. ایچ. آفاق، پروفیسر نعیم احمد خاں، ڈاکٹر تاج الدین، حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، ڈاکٹر محمد محی الحق صدیقی، پروفیسر ملک محمد وامق امین، حکیم تسخیر احمد، ڈاکٹر سعد عثمانی، سید ایس. ایم. عاقل، ڈاکٹر عمران اللہ، ڈاکٹر سید مہتاب علی، ڈاکٹر جنید صدیقی، حکیم اقبال قاسمی، حکیم اشہر قدیر، ڈاکٹر ایس. ایم. ادھمی، ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی، ڈاکٹر صداقت اللہ وغیرہ۔

اس موقعے پر ایک سمپوزیم بھی بعنوان "کیا طب یونانی کی تدریس میں عربی زبان، منطق اور فلسفہ کی ضرورت ہے؟"، منعقد کیا گیا۔ سمپوزیم کی صدارت حکیم تسخیر احمد اور نظامت حکیم اقبال قاسمی نے کی۔ آخر میں پروفیسر ملک محمد وامق امین نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

پریم چند پر سیمینار

● ممبئی۔ منشی پریم چند کے 125 ویں سال ولادت کے موقعے پر "پریم چند: فن اور عصری معنویت" کے موضوع پر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا۔ ابتدا میں ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ جس طرح امتیاز علی عرشی اور مالک رام نے غالبیات سے متعلق تحقیق کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں، اسی طرح مانک ٹالا نے پریم چند سے متعلق تحقیق کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ قومی سیمینار مانک ٹالا کی خدمات کے اعتراف میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے مانک ٹالا کی خدمات کا تعارف پیش کیا۔

اس موقعے پر مانک ٹالا نے شعبۂ اردو کا شکریہ ادا کیا اور پریم چند سے اپنی ذہنی رفاقت کی روداد بھی بیان کی۔ اس کے علاوہ ایک مضمون "کیا پریم چند فرقہ پرست تھے؟" پیش کیا۔ مضمون میں پریم چند کی اسلام دوستی اور مسلم اور دلت سماج سے ان کی ہمدردی پر روشنی ڈالی گئی۔ سیمینار میں پروفیسر خورشید احمد، جناب محمود ایوبی، ڈاکٹر طارق چھتاری، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر رتن کمار پانڈے، ڈاکٹر صاحب علی، ڈاکٹر حمید اللہ خاں، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر افسر فاروقی، محترمہ مسرت، ڈاکٹر صاحب علی اور محترمہ معزہ قاضی نے مضامین پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر اختر حسین رضوی نے کی جب کہ الوداعی جلسے کی صدارت پروفیسر ابے چیتے سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ممبئی یونیورسٹی نے کی۔ مقالہ خوانی کے اجلاسوں کی نظامت ڈاکٹر صاحب علی استاد شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے کی۔

رفعت سروش کا 80 واں جشن ولادت

● دہلی، 6 فروری۔ گذشتہ دنوں اردو کے بزرگ شاعر اور ادیب رفعت سروش کی 80 ویں جشن سالگرہ نورنگ کتاب گھر کی جانب سے ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون میں منائی گئی۔ اس موقعے پر مشہور ادبی اداروں ساہتیہ اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے انھیں ہدیۂ تہنیت پیش کیا گیا۔ پروفیسر طاہر محمود کی صدارت میں جلسے کا آغاز، مخمور سعیدی کی نظامت سے ہوا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ دیکھنے میں رفعت سروش صاحب 80 برس کے نہیں نظر آتے، مگر ان کی کتابوں اور نثر و نظم کی مختلف جہات میں ان کے کام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاید ہمہ وقت لکھتے ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ آج تک فعال ہیں اور نئے سے نیا لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ابن کنول، شاہد خاں، نور ظہیر اور ڈاکٹر رضیہ حامد نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے رفعت صاحب سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی طویل وابستگی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کے یہاں انسان کی عظمت، رجائیت اور ان کی مختصر اور طویل نظموں میں تاریخی شعور ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ انھوں نے خاص طور پر ان کی طویل نظم 'پانی پت' پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی کتابوں "تھکے نہ میرے پاؤں" (سفرنامہ) اور Songs of life (ان کی نظموں کے انگریزی ترجموں پر مبنی کتاب) کا اجرا کیا۔ پروفیسر نارنگ نے رفعت صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے خاص طور پر ان کی شاعری میں غنائیت پر زور دیا، اور کہا کہ یہ خصوصیت خاص طور پر ان کے اوپیراؤں میں ظاہر ہوئی۔ جیسے شاہجہاں کا خواب، اور 'جہاں آرا'۔ بلراج کومل نے کہا کہ وہ یک رخی شخصیت نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں نظم، غزل، طویل نظم، منظوم ڈرامے اور نثری ڈرامے، افسانے، ناول، تاثراتی تصانیف اور خودنوشت سب کچھ ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود نے خاص طور پر ان کے سفرناموں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر طاہر محمود نے ان کی تازہ کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا اور کتاب پر اپنا لکھا ہوا دیباچہ پڑھ کر سنایا۔

(ڈاک سے)

توسیعی خطبہ

● اودے پور۔ شعبۂ اردو موہن لال سکھاڑیہ یونیورسٹی اودے پور میں جنوری میں توسیعی خطبوں کا اہتمام کیا گیا۔ شعبے کا پہلا توسیعی خطبہ 14 جنوری کو منعقد ہوا۔ "اردو کی ادبی تحریکیں (علی گڑھ اور ترقی پسند)"

موضوع پر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا خطبہ پیش کرتے ہوئے اردو ادب میں علی گڑھ اور ترقی پسند تحریکات کی ابتدا کی وجوہ پر روشنی ڈالی اور ادب پر ان کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسندی محض مارکسزم نہیں بلکہ اس میں زندگی کی سیاسی، سماجی و معاشی حقیقتوں کا بیان ہے۔ پروفیسر فاطمی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمارے ادیبوں کو لوک گیتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ قلی قطب شاہ نے ابتدا میں ہی اس کا آغاز کر دیا تھا اور بعد کو نظیر اکبرآبادی جیسا عوامی شاعر ہمارے درمیان گذر چکا ہے۔

شعبے میں دوسرا توسیعی خطبہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے بعنوان ’’آزادی کے بعد اردو شاعری کا منظر نامہ (غزل کے خصوصی حوالے سے)‘‘ 31 جنوری کو پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ کو شاید ادب سے الگ کرنا ممکن ہے مگر ادب کو تاریخ سے مفر نہیں۔ 1947 میں جب ملک آزاد ہوا تو اس سے قبل اردو شاعری کی تاریخ اپنے دامن میں مثنوی، قصیدہ، رباعی، مسدس، مرثیہ، غزل، نظم، جیسی صنف سخن رکھتی تھی۔ حالات بدلے تو ادب میں بھی نئے تجربے ہوئے۔ آزادی کے بعد شعری ادب میں نئی اصناف دوہا، ہائیکو، نظمانے، ترائیلے، کبت، چوپائی، ماہیا، Limrick، غزل نما وجود میں آئیں۔ جہاں ان نئی شعری اصناف نے جنم لیا وہیں قدیم اصناف میں ہیئت، تکنیک، اسلوب اور موضوع کی سطح پر تبدیلیاں آئیں۔

اس موقعے پر شعبے کی انچارج ڈاکٹر زینب بانو نے شعبۂ اردو کی گذشتہ دو برسوں کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ جلسے کی صدارت پروفیسر آر. این. ویاس ڈین کالج آف سوشیل سائنس اینڈ ہومینٹیز نے کی اور مہمان خصوصی پروفیسر ارون چتر ویدی سابق ڈین تھے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر غلام آسی رشیدی نے کی۔ 31 جنوری کو ہوئے توسیعی خطبے کی نظامت ڈاکٹر فرغانہ نے کی اور محمد افضل نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

رضا لائبریری میں مخطوطات کی نمائش

● رام پور، 13 فروری۔ رضا لائبریری کی حامد منزل میں ایک ہفتہ تک چلنے والی مخطوطات کی نمائش کے اختتامیہ جلسے میں نیشنل میوزیم، دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس. پی. سنگھ نے کہا کہ ہماری تہذیبی وراثت مخطوطات اور ظغروں میں چھپی ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان میں پچاس لاکھ مخطوطے تھے مگر لوگوں کی لاپروائی اور انھیں صحیح ڈھنگ سے نہ رکھنے کے سبب 25 لاکھ مخطوطات ضائع ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ قومی مشن برائے مخطوطات کے ذریعہ ملک میں مخطوطات کی جو فہرست سازی کی جارہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مخطوطات کی اسمگلنگ میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے رضا لائبریری اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کو مخطوطات کا خزانہ قرار دیا۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے بتایا کہ دس سال کے دوران رضا لائبریری نے جو مخطوطات، نوادرات اور سکّے خریدے۔ ان میں سے معمولی چیزوں کو نمائش میں رکھا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان ایام میں بیشمار قیمتی مخطوطوں کے ساتھ 2 ہزار قبل مسیح کے مٹی کے برتن، 500 سال قبل مسیح کے دو ہزار سکّے بھی خریدے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ رضا لائبریری میں 7 ہزار مخطوطات ہیں جو انتہائی اہم ہیں اور بعض مخطوطے دنیا کی کسی لائبریری میں نہیں ہیں، انھوں نے بتایا کہ رضا لائبریری کی لیباریٹری میں اب تک ایک ہزار مخطوطوں کو درست کر کے انھیں نئی زندگی دی گئی ہے۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے کہا کہ تہذیب کی علامتوں میں مخطوطات کا اہم حصہ ہے۔ سید مرتضیٰ علی فرحت نے بتایا کہ نوابین کا شوق تھا کہ نادر چیزوں کو جمع کیا جائے اس کا ثبوت رضا لائبریری کا خزانہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ رضا لائبریری کے قیام کے 232 سال بعد پہلی مرتبہ نمائش لگائی گئی ہے جس میں عیسیٰ مسیح سے دو ہزار سال قبل کی کلہاڑی اور میر تقی میرؔ کا اپنے ہاتھ سے تصحیح شدہ دیوان، تانبہ پر کھدا ہوا آلم کا سپارہ، 1860 کا سونے سے لکھا ہوا نواب واجد علی شاہ کے خاندان کا نکاح نامہ جس میں 20 لاکھ روپے مہر مقرر ہوا ہے رکھا ہے۔ جسے دیکھ کر ہر شخص حیرت زدہ ہے۔ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے شکریہ ادا کیا۔ (’’قومی آواز‘‘، دہلی)

مرکزی حکومت سے ترقی اردو تنظیم کا مطالبہ

● نئی دہلی، 27 فروری۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے لیے مرکزی حکومت سے ٹھوس اقدامات کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ کئی ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے باوجود اسے عملاً نافذ نہیں کیا گیا ہے۔ تنظیم کی طرف سے جاری ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش اور دہلی میں اردو کو حالانکہ دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن ان ریاستوں میں قانون اردو کا نفاذ پوری طرح نہیں کیا جارہا ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ گوکہ ان ریاستوں میں منی آرڈر فارم، مقابلہ جاتی امتحانات کے سوالنامے، راشن کارڈ، ووٹر لسٹ، بیلٹ پیپر اور پرچۂ نامزدگی وغیرہ قانوناً اردو

میں شائع کرنا لازمی ہے لیکن ریاستی حکومتیں آج تک اس قانون کو نظر انداز کر رہی ہیں۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اردو عوام سے بھی معلوم کیا ہے کہ کیا انھوں نے کبھی اپنی عرضیاں اور درخواستیں اردو میں دیں اور انھیں قبول کیا گیا یا نہیں؟ تنظیم کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ الہ آباد ہائی کورٹ کے سینئر وکیل اے۔ اے۔ کلیم کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں اشاعت قانونی طور پر لازم ہے۔ اسی طرح سرکاری گزٹ کو اردو میں بھی شائع کرنا قانونی طور پر ضروری ہے۔ ("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

اردو اساتذہ کے لیے ورک شاپ

● حمایت نگر۔ مجلس انتظامی اردو ماڈل اسکول، حمایت نگر و مغل پورہ کی جانب سے اردو ذریعۂ تعلیم کے اساتذہ کے لیے انگریزی، اردو، ریاضی، سائنس اور سماجی علوم کے طریقۂ تدریس سے متعلق ایک ورک شاپ 2 تا 7 فروری گلشن حبیب، اردو ہال، حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ ورک شاپ تحتانی و ثانوی اسکول کے اساتذہ کے لیے رکھا گیا تھا۔ ماہر اساتذہ نے جونیر اساتذہ کو روزانہ ایک مضمون کے طریقۂ تدریس سے واقف کرایا۔ ورک شاپ کی افتتاحی تقریب کی صدارت حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے نظامت فاصلاتی تعلیم کے ڈائرکٹر جناب شوکت حیات نے کی۔ مہمان خصوصی محترمہ مریم زمانی صدر مدرس معظم جاہی مارکیٹ گرلز اسکول اور جناب عبدالرحیم خاں پرنسپل اردو آرٹس کالج نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔

محترمہ بلقیس بیگ نے انگریزی داں کی حیثیت سے شرکت کی۔ دوسرے دن اردو مضمون کے ورک شاپ کا آغاز ہوا جس میں جناب خالد سعید نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جناب جلیل الدین نے اردو طریقۂ تدریس کی تفہیم کے لیے نمونتاً ایک سبق پیش کیا۔ 4 فروری کو ریاضی کے ورک شاپ کا آغاز ہوا۔ جناب رؤف الدین نے اساتذہ کی رہنمائی کی۔ عبدالرحیم خاں اور جناب عبدالحمید نے بھی طریقۂ تدریسِ ریاضی کے بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

6 فروری کے ورک شاپ کا موضوع سائنس تھا جس کی صدارت ڈاکٹر یوسف کمال نے کی۔ محترمہ فہیم النسا نے سائنس کے طریقۂ تدریس سے متعلق ایک سبق پیش کیا۔ 7 فروری کو سماجی علوم پر ورک شاپ کا آغاز ہوا جس کی صدارت پروفیسر مسعود علی خاں نے کی اور مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر یوسف اعظمی تھے۔ محترمہ حبیب النسا نے سماجی علوم کے طریقۂ تدریس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ورک شاپ کے آخری دن اختتامیہ تقریب منعقد کی گئی، جس کی صدارت جناب محمود بن محمد آئی۔ پی۔ ایس۔ سابق سفیر ہند سعودی عرب نے کی۔ اس میں شریک اساتذہ نے ورک شاپ سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ (ڈاک سے)

ادبی جلسہ

● گلبرگہ، 24 فروری۔ انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کے زیر اہتمام 19 فروری کی شب فاران کالج گلبرگہ میں ممتاز ادیب و نقاد جناب وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکاڈمی کی صدارت میں ایک محفل طنز و مزاح کا انعقاد عمل میں آیا۔ ابتدا میں سابق نائب صدر انجمن پروفیسر جلیل تنویر نے مہمانان کا استقبال کیا اور ممتاز افسانہ نگار و شاعر پروفیسر حمید سہروردی نے مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ نثری محفل میں جناب منظور وقار نے اپنا طنزیہ مضمون "جشن ہی جشن" جناب مرزا عابد علی بیگ نے اپنا مضمون "حادثہ چاہیے زندگی کے لیے" ممتاز شاعر شاذ تمکنت کے بھائی جناب سید امتیاز الدین نے اپنا مزاحیہ مضمون "اور ہم ریٹائر ہو گئے" اور جناب مجتبیٰ حسین نے اپنا مزاحیہ مضمون "مرزا دعوت علی بیگ"، "صاحب باتھ روم میں ہیں" اور "مرزا غالب کا خط مرزا مجتبیٰ کے نام" پیش کیا۔ جلسے کے مہمان خصوصی صدر فاران ایجوکیشن سوسائٹی گلبرگہ جناب عبدالحمید تھے۔

اور صدارت جناب وہاب عندلیب نے کی۔ نثری محفل کے بعد شعری محفل میں محترمہ صبیح حیدر صبیح، علی ظہیر، سید احمد ایثار، طالب خوندمیری، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ نے سنجیدہ اور مزاحیہ کلام پیش کیا۔ شریک معتمد جناب میر شاہنواز شاہین کے شکریے پر جلسے کا اختتام ہوا۔

ساہتیہ اکادمی تراجم ایوارڈ 2005

● نئی دہلی، 21 فروری۔ 20 ہندوستانی زبانوں میں ساہتیہ اکادمی تراجم ایوارڈ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ صدر اکادمی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں مجلس انتظامیہ نے اپنے اجلاس میں اکادمی کے تراجم ایوارڈ 2005 کو منظوری دی۔ جن 20 کتابوں پر انعامات کا اعلان کیا گیا ہے ان میں ہندی کی چار اور انگریزی کی چھ کتابیں شامل ہیں جن کا مع اردو مختلف ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اردو میں ترجمے کے لیے ڈاکٹر خالد محمود کو منتخب کیا گیا۔ انھوں نے ممتاز پنجابی ناول نگار اجیت کور کے ناول 'گوری' کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو جیوری میں محترمہ ذکیہ مشہدی، ف س اعجاز اور مقدر حمید شامل تھے۔ دیگر انعام یافتگان میں ہندی ترجمے کے لیے محترمہ نرملا جین، انگریزی

ترجمے کے لیے پرتیک گنجی لال، کشمیری ترجمے کے لیے شفیع شوق، بنگالی ترجمے کے لیے رنجن بندوپادھیائے، میتھلی ترجمے کے لیے یوگانند جھا اور سندھی ترجمے کے لیے ہوندراج بلوانی شامل ہیں۔ ("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

جلسہ تقسیم اسناد

● نئی دہلی، 28 فروری۔ انجمن ترقی اردو (ہند) انفارمیشن اینڈ ٹکنالوجی سینٹر میں کمپیوٹر کورس کے کامیاب طلبہ میں دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال نے اسناد تقسیم کیں اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کی۔ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے تعارفی تقریر میں انجمن کی کارگزاریوں سے واقف کراتے ہوئے بتایا کہ کمپیوٹر کے طلبہ کا یہ تیسرا بیچ ہے جس میں دونوں شفٹوں میں 80 طلبہ شامل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کمپیوٹر کورس کرنے والے 70 فیصد سے زیادہ طلبہ اب تک برسر روزگار ہو چکے ہیں۔ اس موقعے پر کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ نے بتایا کہ کونسل کے ملک بھر میں کمپیوٹر کے 184 سینٹر چل رہے ہیں جن میں سے درجن بھر دہلی میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کورس کے ذریعے کونسل نوجوانوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرا رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کونسل کا کئی کروڑ روپے کا بجٹ ہے جس میں سے 65 فیصد اس مد میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ جناب شعیب اقبال نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج جس تعداد میں غیر مسلم طلبہ و طالبات اردو کورس اور اردو کمپیوٹر ڈپلوما کر رہے ہیں یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اردو زبان روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ شعیب اقبال نے کہا کہ آج اردو کی افادیت اور اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ خاص طور سے چینلوں کی دوڑ میں اردو اور ترقی کر رہی ہے۔ کیونکہ الیکٹرانک میڈیا کے لوگ اپنا تلفظ درست کرنے کے لیے بھی اردو زبان سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے قومی اردو کونسل اردو اور انجمن ترقی اردو کی کارکردگی پر بھی اطمینان کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر اول آنے والی طالبہ شبانہ شفیق، دوئم محمد شریف اور سوئم کسم ورما کو سند اور ٹرافی کے علاوہ خصوصی تحفہ بھی دیا گیا۔ اس تقریب میں انجمن ترقی اردو ہند کے نائب صدر جناب شریف الحسن نقوی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز اور مظہر الاسلام اسکول کے پرنسپل مشتاق بیگ نے بھی شرکت کی۔

("راشٹریہ سہارا" دہلی)

بین مدارس ادبی مقابلے

● حمایت نگر (حیدرآباد)۔ بین مدارس ادبی مقابلہ جات 27 اور 28 جنوری کو انیس بلاک گلشن حبیب، حمایت نگر میں منعقد کیے گئے۔ ان دو روزہ مقابلوں میں پہلے دن تحریری اور تقریری مقابلہ بطور خاص ہائی اسکول کے طالب علموں کے لیے رکھا گیا۔ تحریری مقابلے کا عنوان "میرا شہر حیدرآباد" اور تقریری مقابلے کا موضوع "ٹیلی ویژن میری نظر میں" تھا۔ اس میں تقریباً 18 مدرسوں سے بالترتیب 45 اور 35 طالب علموں نے شرکت کی۔ محترمہ ساجدہ ادیب نے بہ حیثیت صدر شرکت کی اور جج کے فرائض ڈاکٹر حمیرا جلیلی، محترمہ انیس عائشہ، ڈاکٹر فرزانہ اور محترمہ آمنہ تحسین نے انجام دیے۔

مڈل اسکول کے طالب علموں کے لیے نظم خوانی کے مقابلے میں علامہ اقبال کی نظم "ہمدردی" منتخب کی گئی تھی۔ اس مقابلے کے صدر منظور احمد سابق استاد گورنمنٹ کالج اور مہمان خصوصی ڈاکٹر رفعت سلطانہ سابق صدر شعبۂ اردو ونیتا مہا ودیالیہ تھیں اور جج کے فرائض محترمہ سعدیہ مشتاق، ڈاکٹر شاہدہ امیر اور سید امتیاز الدین نے انجام دیے۔

ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے ادبی اور جنرل کوئز کے مقابلے کی صدارت پروفیسر رحمت یوسف زئی سابق صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے کی۔ 31 جنوری کو ڈاکٹر سید عبدالمنان اور محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے بہ حیثیت صدر شرکت کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، محترم نصرت محی الدین، محترم سجاد شاہد شریک اجلاس رہے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● گلبرگہ، 19 فروری۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے خواجہ بندہ نوازؒ ایوانِ اردو میں منعقدہ جلسہ تفویض گولڈ میڈل و تقسیم اسناد میں بہ حیثیت مہمانِ خصوصی ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین اور جناب ریاض احمد جوائنٹ کمشنر کمرشیل ٹیکس نے شرکت کی۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کا یہ اجلاس پی یو سی سال دوم کے سالانہ امتحان میں اردو پارٹ۔1 کے تحت ریاستی سطح پر سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والے امیدوار کو گولڈ میڈل اور دوم و سوم آنے والے امیدواروں کو نقد انعامات سے نوازنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ مہمانانِ خصوصی کے ذریعے محمد سائرہ بانو (الامین ملک ریحان پی یو کالج سرا، ٹمکور) نے گولڈ میڈل، روحی تمثیل فاطمہ (شاہین پی یو کالج بیدر) اور شیریں بانو جینڈی گری (گورنمنٹ پی یو کالج منڈا گوڈ، نارتھ کینرا) نے نقد انعامات حاصل کیے۔ جناب خواجہ پاشاہ انعامدار (معتمد انجمن) نے خیر مقدمی تقریر کی۔ بعد ازاں جناب وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکاڈمی نے انجمن کے تعلیمی فنڈ کے قیام اور اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔ آخر میں جناب شریف احمد قریشی نے والدین سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو مادری زبان کے ذریعے تعلیم دلوائیں اور انجمن کے تعلیمی فنڈ کو اپنے گرانقدر عطیے سے مستحکم کریں۔ جناب ولی احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب محمد مجیب احمد کے شکریے پر اس اجلاس کا اختتام ہوا۔

● سیتا پور (یو. پی.) 20 جنوری۔ مسلم جونیئر ہائی اسکول سیتا پور میں بزمِ اردو سیتا پور کا 35 واں یومِ تاسیس منایا گیا جس کی صدارت مشہور شاعر اقبال محشر رائے بریلوی نے کی ۔ بزمِ اردو سیتا پور کے صدر پدم شری قاضی عبدالستار نے اپنی مادری زبان اور تہذیب کی حفاظت کی پرزور وکالت کی۔ مہمان خصوصی جناب شیو شنکر تھے۔ بزمِ اردو کے جنرل سکریٹری مست حفیظ رحمانی نے 35 سال کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 11305 لوگوں کو جامعہ اردو کا امتحان دلوایا جا چکا ہے اور 13648 لوگوں کو اردو پڑھنا اور دستخط کرنا سکھایا گیا ہے۔ اس موقعے پر اشتیاق صبا، افسانہ نگار صادق علی انصاری، عارف محمد عارف، طارق قمر، تسنیم فاروقی، خالد علوی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کے کنوینر رضوان خاں تھے۔ اس موقعے پر تسنیم فاروقی، خالد علوی، صادق علی انصاری، اشتیاق علی صبا، طارق قمر، دبیر ستیاپوری، خان احمد صدیق اور منظر حسین کو اردو ادب ایوارڈ سے نوازا گیا، اور عمران سیتا پوری، اسرہ عاصف، سرتاج عالم کو بھی اردو میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے پر انعام دیا گیا۔ اس موقعے پر ایک کامیاب مشاعرے کا اہتمام کیا گیا اور مشہور شاعر تسنیم فاروقی کا نعتیہ کلام ''رحل'' کا اجرا عمل میں آیا۔

● دربھنگہ۔ 5 فروری۔ ادبی دالان کی جانب سے منعقدہ ایک ادبی نشست میں شاعر جمال اویسی نے ''مردہ کتابوں کے جنگل میں زندہ آدمی کی تلاش'' کے عنوان سے مضمون پیش کیا۔ جنید عالم آروی، فیاض احمد وجیہہ اور مجیر احمد آزاد نے بالترتیب ساری، سیاہ بادل اور اندھیرے کا کرب۔ جلسے میں وجے کمار سنگھ (صدر نشست)، آزاد، خالد حسین وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت جناب خالد حسین نے کی۔ اس موقعے پر منصور خوشتر، شاکر حسین، سہیل اعظم، افضل حسین، محمد کلیم اللہ اور خالد حسین صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے شکریہ ادا کیا۔ **(ڈاک سے)**

● جلگاؤں (مہاراشٹر)۔ اردو قبیلہ کی جانب سے شام افسانہ منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی رونق جمال، عارف خاں، وحید امام، مشتاق کریمی، سعید پٹیل، قیوم اثر، رشید قاسمی، سہیل رحمان نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ رونق جمال نے کئی مختصر کہانیاں سماج، فساد، رشوت خوری اور انسانیت پر سنائیں ۔ آخر میں مزاحیہ کہانی ''کراماتی بکرا'' پیش کی۔ اس جلسے کی صدارت جلگاؤں کے میئر جناب عبدالکریم سالار نے کی۔ **(ڈاک سے)**

● درگ (چھتیس گڑھ) چھتیس گڑھ اردو اکادمی کی جانب سے مسلم سرائے، تکیہ پارہ، درگ میں ایک کل ہند مشاعرہ اور تقریب اعزاز کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جناب مکند کوشل کے دیوناگری کے شعری مجموعے بعنوان ''چراغ غزلوں کے'' کا اجرا ڈاکٹر منشا الرحمٰن خان منشا ناگپوری نے کیا۔ رونق جمال نے کتاب پر اظہار خیال کیا۔ اردو کی خدمات کے لیے درگ کے بزرگ شاعر جناب بدر قریشی بدر کو ''مینار اردو'' کے خطاب سے نوازا گیا، اسرائیل شاد، کرونا ساہو، انیس قریشی اور نظام کو بھی اردو کے فروغ کے لیے ایوارڈ دیا گیا۔ جلسے و مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر منشا الرحمٰن منشا ناگپوری نے کی اور رفیع الدین رئیس، تاج ور سلطانہ، تاج الہ آبادی، ظفر اعظمی، منشا ناگپوری، ندیم کانپوری، شاد بلاسپوری، بدر صاحب، عبدالسلام کوثر، ماجد علی، شوق جالندھری، کاوش حیدری، رضا حیدری نے اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت رئیس مالیگانوی نے کی۔ اظہار تشکر اردو اکیڈمی کے نائب صدر مرزا اعجاز بیگ نے کیا۔ **(ڈاک سے)**

● بھاگلپور۔ امریکن بایو گرافیکل انسٹی ٹیوٹ (نارتھ کارولینا) یو.ایس.اے. نے 2006 میں اردو کے معروف قلم کار ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ''دی ورلڈ میڈل آف فریڈم'' خصوصی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی ابھی تک 98 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ رسالہ ''کوہسار جرنل'' کے مدیر ہیں اور بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

● دربھنگہ۔ اتوار، 5 فروری۔ طب یونانی ویلفیر سوسائٹی کی جانب سے سوسائٹی کے دفتر اور کتب خانے کی افتتاحی تقریب کی صدارت سابق پرنسپل ملت کالج ڈاکٹر عبدالعلیم ہلال نے کی۔ افتتاح مہمان خصوصی ڈاکٹر سید عبدالعزیز سلفی نے کیا۔ اس تقریب میں مہمانان اعزازی حکیم معاذ سلفی، ڈاکٹر عبدالوہاب، چودھری محمود عالم، ڈاکٹر عبدالعلیم ہلال، ڈاکٹر رئیس انور رحمٰن، ڈاکٹر علاء الدین حیدر وارثی و عنبر امام ہاشمی تھے۔ اس تقریب حکیم رضا احمد، حکیم اسرائیل سلفی، حکیم محمد شارق، حکیم صدر الدین، شبیر احمد، غزالی انور ہلال، غیور علی فریدی، محمد انیس اللہ انجم، رافع الہدیٰ، محمد ساجد، ناصر حسین، ارشاد عالم، اسامہ ارشد، محمد امجد عالم، محمد ولی، محمد امداد اللہ، محترمہ شکوہ فاطمہ، آصفہ عارفی، فرزانہ خاتون، محمد اشرف، محمد عارف شوکت اور سوسائٹی کے دیگر تمام ارکان نے اہم کردار ادا کیا۔ **(ڈاک سے)**

رسم اجرا

گوتم

● نئی دہلی، 27 فروری۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''شام شہر یاراں'' کے موقعے پر مشہور ناول نگار بلراج ورما کے ناول ''گوتم'' کی رسم رونمائی پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس نے بلراج ورما کے ناولوں اور افسانوں کے حوالے سے کہا کہ بلراج ورما ہندوستان کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں ملک کی سیکولر روایات کی

جھلک ملتی ہے۔ شاہد ماہلی نے تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے بلراج ورما کو اس ناول کی اشاعت پر مبارک باد دی۔ ڈاکٹر ابنک نول، پروفیسر عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، ڈاکٹر سلمٰی شاہین، مسعود فاروقی، ادریس احمد اور ڈاکٹر رضا حیدر کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم وادب نے اس جلسے میں شرکت کی۔
(ڈاک سے)

دھوپ کی بالکونی سے

● الہٰ آباد۔ "اردو گھر" میں جمشید پور کے نوجوان شاعر ناصر راہی کی کتاب "دھوپ کی بالکونی سے" کی رسم اجرا اردو کے معروف نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے انجام دی۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ناصر راہی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ ناصر راہی نثری نظموں کے ایک کامیاب شاعر ہیں۔ نئی نسل کے لکھنے والوں میں ناصر راہی کا شمار کیا جاتا ہے۔ نیشنل اردو رائٹرس ایسوی ایشن اور "اردو گھر" کی جانب سے شاہ آفتاب احمد نے تمام شاعروں اور ادیبوں کا خیر مقدم کیا، انجمن کے جنرل سکریٹری خواجہ جاوید اختر نے ناصر راہی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ناصر راہی "شب خون" کے ذریعے ادب میں پہچانے گئے۔ مہدی جعفر اور ایم.اے قدیر نے ناصر راہی کی کتاب کے حوالے سے مضمون پڑھا۔

اس موقعے پر ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس کی صدارت ایم.اے قدیر نے کی، اس مشاعرے میں جوگا سنگھ انور، اسلم بدر، انور ادیب، اور حسن فتح پوری کے علاوہ حبیب رہبر، ضمیر احسن، حباب ہاشمی، مظہر نسیم، نصر قریشی، خواجہ جاوید اختر، نایاب بلیاوی، نیّر عاقل، اختر عزیز، امتیاز احمد غازی، اور انتظار غازی پوری نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں انجمن ترقی اردو ہند (جمشید پور) کے صدر سید رضا عباس رضوی اور اردو گھر کی جانب سے خورشید نقوی نے اظہار تشکر کیا۔ (ڈاک سے)

آنند لہر: شخصیت اور فن

● جموں، 10 فروری۔ جموں و کشمیر اردو فورم، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں، انجمن ترقی اردو شاخ ڈوڈہ، نمی ڈوگری سنستھا جموں، کی جانب سے اردو کے معروف افسانہ نگار آنند لہر کی شخصیت اور فن پر فدا کشتواڑی کی کتاب "آنند لہر: شخصیت اور فن" کی تقریب رونمائی جموں کشمیر کلچرل اکادمی کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر ظہور الدین نے کی اور مہمانان خصوصی جموں کشمیر کے ممتاز ادیب اور مفکر محمد یوسف ٹینگ اور پدم بھوشن بلراج پوری تھے، ان کے علاوہ ڈاکٹر شہاب عنایت ملک اور مورخ ولی محمد اسیر کشتواڑی نے بھی شرکت کی۔ جلسے میں صحافی اور ادیب آر.کے. بھارتی نے مقالہ پیش کیا۔ جناب محمد یوسف ٹینگ نے کہا کہ جموں میں آنند لہر جیسا باصلاحیت افسانہ نگار اور ناول نگار موجود ہے، جو اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات سے پوری طرح واقف ہے۔ فدا کشتواڑی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آنند لہر کے تخلیقی کام اور اردو زبان سے ان کی محبت اور لگاؤ سے متاثر ہو کر ان کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اچھے ادیب کے ساتھ ساتھ وہ ایک انسان دوست، غریب پرور اور اخلاقی اقدار کے پاسدار بھی ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے ڈاکٹر شہاب عنایت ملک اور مورخ ولی محمد اسیر کشتواڑی نے بھی خطاب کیا۔
(ڈاک سے)

بچوں کی کہانیاں

● کڑپہ۔ استاد و شاعر ستار فیضی کی مرتب کردہ کتاب "بچوں کی کہانیاں" کی تقریبی رسم اجرا میں ڈاکٹر عبد الستار ساحر نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ آج اطلاعاتی وانقلاب کے دور میں کمپیوٹر اخلاق وکردار نہیں سکھا سکتے۔ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ تحتانوی اسکولوں میں اخلاقی تعلیم کی بنیاد کہانیوں سے ڈالیں تاکہ بچوں کی شخصیت سازی ہو سکے اور وہ اچھے شہری بن سکیں۔

گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج کڑپہ کے پرنسپل ڈاکٹر انیس عالم باشاہ مولانا احمد بشیر ڈپٹی آفیسر آف اردو اسکول، عبد الرب، ڈاکٹر انور اور ڈاکٹر ساغر حیدری نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

رشید حسن خاں

● نئی دہلی، 26 فروری۔ اردو کے ممتاز ومعروف محقق رشید حسن خاں کا 25 فروری کو ان کے وطن شاہ جہاں پور میں انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر گلزار دہلوی اور رفعت سروش نے ان کے انتقال کو اردو دنیا کا عظیم نقصان قرار دیا ہے۔ مرکزی علم و دانش کی تعزیتی میٹنگ میں ابرار کرت پوری، شعیب مرزا، ڈاکٹر تابش مہدی، فصیح اکمل قادری اور سعید بلگرامی نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

● نئی دہلی، 27 فروری۔ محقق رشید حسن خاں کے انتقال پر مختلف ادبی شخصیات نے گہرا صدمہ ظاہر کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ رشید حسن خاں متنی تحقیق کے سب سے روشن چراغ تھے، باغ و بہار، گلزار نسیم اور اردو املا پر ان کا کام یادگار رہے گا۔ انھوں نے رشید حسن خاں کی زندگی کو اس امر کی روشن مثال قرار دیا کہ ادب میں عہدہ یا رتبہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان کی پرکھ اور پہچان اس کے علمی کام سے ہے۔ پروفیسر قمر رئیس، مظہر امام،

ابوالکلام قاسمی، حقانی القاسمی اور دوسرے ارباب علم و ادب نے بھی رشید حسن خاں کی رحلت پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر میں انجمن کے نائب صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں انجمن کے کارکنوں کے علاوہ جناب سید شریف الحسن نقوی، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر فیروز دہلوی اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے بھی شرکت کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ رشید حسن خاں ہمیشہ اپنے سے چھوٹے محققین کی رہنمائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ رشید حسن خاں صاحب ہماری علمی اور ادبی روایت کے امین تھے۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کے ساتھ ساتھ رشید حسن خاں اس کہکشاں کے ایک تابندہ ستارہ تھے۔ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر ابن کنول نے کہا کہ رشید حسن خاں نہ صرف اردو کے بڑے محقق تھے بلکہ ایک سچے اور مخلص انسان بھی تھے۔ ان کے انتقال سے ہم نے ایک اہم محقق کو کھو دیا ہے۔ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کا مرکز اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں بھی مرحوم کی یاد میں تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔

● غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ تعزیتی جلسے میں انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ مرحوم کے انتقال سے اردو تحقیق کے ایک بڑے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ متنی تحقیق میں آپ کے جو کارنامے ہیں اسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اردو املا کتاب اردو تحقیق میں ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے کہا کہ رشید حسن خاں کا غالب انسٹی ٹیوٹ سے پرانا رشتہ تھا اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے مجلّے ’’غالب نامہ‘‘ کی مجلس ادارت میں رہ کر انھوں نے رسالے کو امتیازی مقام پر پہنچایا۔

● کانپور میں ایک تعزیتی جلسہ نامی انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تمام شرکا نے اپنے دلی صدمے کا اظہار کیا اور ان کے شاندار ادبی کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا۔ نامی انصاری نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بڑے محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بیحد خلیق اور وضعدار انسان بھی تھے۔ انھوں نے تحقیق میں سچ کی دریافت اور اس کے اظہار کو اپنا مسلک بنا لیا تھا اور اس باب میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ تحقیق میں اتنی صفائی اور اتنا بے لچک رویہ شاید ہی کہیں دوسری جگہ نظر آئے۔ وہ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسین رضوی اور امتیاز علی عرشی کے قبیلے کے آخری فرد تھے۔

عشرت ظفر نے کہا کہ رشید حسن خاں کا تنقیدی شعور بھی اتنا پختہ اور دور رس تھا کہ ان کے تنقیدی نتائج سے اختلاف کرنا بہت مشکل تھا۔ حالی کی نئی اور پرانی غزلوں کا محاکمہ انھوں نے جس دقتِ نظر سے کیا ہے وہ ان کے تنقیدی شعور کی روشن مثال ہے۔ افسانہ نگار تسکین زیدی نے کہا کہ رشید حسن خاں اردو تحقیق کی آبرو تھے۔ ان کے درجے کا محقق اب شاید ہی کبھی منصۂ شہود پر آئے۔ خان احمد فاروق نے کہا کہ رشید حسن خاں، اردو تحقیق کا ایک ایسا روشن منارہ تھے، جس کی روشنی آنے والے زمانوں میں بھی قائم رہے گی۔ مولانا قمر شاہجہاں پوری، شاعر فتحپوری، ضیا فاروقی، جمیل اختر نعمانی، یوسف علوی، چاند میاں طیب اور خورشید الرحمٰن حنفی نے بھی رشید حسن خاں کی رحلت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔

نشتر خانقاہی

● نئی دہلی، 8 مارچ۔ ممتاز ادیب، شاعر و صحافی جناب نشتر خانقاہی کا 7 مارچ کو آٹھ بجے شب طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 76 سال تھی۔ ان کے وارثین میں اہلیہ کے علاوہ چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ وہ ہڈیوں کی ٹی بی کے مریض تھے۔ وہ بیس سال پیشتر دہلی چھوڑ کر اپنے آبائی وطن بجنور چلے گئے تھے۔

ان کا خاندانی نام انوار حسین سید تھا۔ وہ 1930 میں موضع جہاں آباد ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ گھریلو تعلیم کے بعد وہ دہلی چلے آئے، جہاں انھوں نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا، اور اس دور کے اہم اور مقبول ماہناموں ’شاہراہ‘ اور بیسویں صدی کی ادارت کی ۔ اس کے بعد انھوں نے ’سو برس‘، ’مشاہدہ‘، اور روز نامہ ’خبر جدید‘ میں ادارتی ذمے داریاں سنبھالیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے ’میرے لہو کی آگ‘‘، ’دسترس‘، ’سرائے میں شام‘، ’منظر پس منظر‘، ’معلوم نا معلوم‘ شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنی حیات میں ہزاروں مضامین لکھے جو ہند و پاک میں بہت مقبول ہوئے ۔ بجنور کے ہندی ادیبوں نے ان کی منتخب تخلیقات کو ہندی رسم خط کا جامہ پہنایا اور ان کے چھ ہندی مجموعے ’’دھمکی بازی کے یگ (مزاح) ’’غزل میں نے چھیڑی‘‘ (انتخاب) ’’ موم کی بیساکھیاں‘‘ (غزلیں) ’’ کیسے کیسے لوگ ملے‘‘ (سوانح‘‘ ’’ دنگے کیوں اور کیسے۔ وشو آتنک واد‘‘ ’’ کیوں اور کیسے مانو ادھیکار‘‘ ’’ دشا اور وشا‘‘ شائع کیے۔

□□□

تبصرہ وتعارف

مجموعۂ نغز/ حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ
مرتب: محمود شیرانی
صفحات: 454، قیمت: 268 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: مخمور سعیدی

یہ فارسی زبان میں اردو شاعروں کا مشہور تذکرہ ہے جسے محمود خاں شیرانی نے دو قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے پہلی بار لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ انھیں مولانا محمد حسین آزاد کے ذخیرۂ کتب مملوکہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی سے دستیاب ہوا تھا اور دوسرا نسخہ مقابلے کے لیے انھوں نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے منگوایا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ پہلا نسخہ خود مصنف کے قلم سے ہے انھوں نے اس کے دلائل بھی دیے ہیں مثلاً جگہ جگہ عبارت کی اصلاح یا حک و اضافہ، درج شدہ اشعار میں کمی بیشی اور خود مصنف کے تقریباً ایک سو اشعار کا حذف کر دیا جانا۔ انھوں نے اپنے کام کی بنیاد اسی نسخے کو بنایا ہے۔ دوسرے نسخے میں کاتب کی کم سوادی سے بہت سی غلطیاں نثری عبارت اور اشعار میں راہ پا گئی ہیں۔ تاہم جہاں ضرورت سمجھی ہے شیرانی صاحب نے اس سے بھی کام لیا ہے۔

صاحب تذکرہ حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم پنجاب کے قصبۂ گجرات کے ایک معروف اور معزز خاندان کے فرد تھے۔ آبائی پیشہ درس و تدریس تھا اور ان کے گھرانے میں پیری مریدی کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ان کے بزرگوں کو خاص ارادت و نسبت تھی اس لیے وہ اپنے ناموں کے ساتھ قادری بھی لکھا کرتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے خود قاسم کی عقیدت کی گواہ ان کی مثنوی ''کرامات پیران پیر'' ہے جس سے قاسم کی زندگی کے بعض ابتدائی حالات و واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس کے سوانحی اشارے شیرانی صاحب نے اس مثنوی کی مدد ہی سے فراہم کیے ہیں۔ تذکرے کا سال تالیف 1291ھ ہے۔

اس مثنوی میں قاسم ہمیں بتاتے ہیں کہ جب والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ تین برس بعد گیارہ سال کی عمر میں میر فتح علی خاں حسینی نے انھیں دہلی لے جا کر مولانا فخرالدین کے مدرسے میں داخل کرا دیا جہاں انھوں نے سید احمد ابا حسن کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ وہ سفر حضر ہر حالت میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مصارف کے کفیل ان کے نانا تھے جنھیں امیر الامرا نجیب الدولہ بہادر کی سرکار سے توسل تھا۔ قاسم فن شعر میں ہدایت اللہ خاں ہدایت اور فن طب میں حکیم محمد شریف خاں کے شاگرد تھے۔ قاسم نہ کسی دربار سے وابستہ ہوئے نہ پیری مریدی کو پیشہ بنایا، طبابت ہی ان کا ذریعۂ معاش بنی۔ ان کے بیٹے عزت اللہ بھی شاعر تھے اور عشق تخلص کرتے تھے۔ فن شعر پر ان کی دسترس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ذوق سے پہلے بہادر شاہ ظفر کے کلام پر بھی وہ اصلاح دیا کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں اس خاندان کی رسائی قلعۂ معلی تک تھی۔

''مجموعۂ نغز'' فارسی زبان میں ہے۔ نثر کا اسلوب سادہ و سلیس ہے لیکن کہیں کہیں اسے مقفّیٰ اور مسجع بھی کر دیا گیا ہے جو اس دور کا پسندیدہ اسلوب تھا۔ حکیم صاحب خود شاعر تھے اور اپنے دور کے اکثر باکمال شاعروں کی صحبتیں انھیں میسر آئی تھیں۔ شعرا کے کلام اور ان کے شاعرانہ مقام کے بارے میں ان کی رائیں وقیع اور منصفانہ ہیں۔ بعض شعرا کے رویے کے وہ شاکی بھی ہیں مثلاً شاہ نصیر، انشاء اللہ خاں انشا اور میر تقی میر لیکن ان کے شاعرانہ مرتبے کے اعتراف میں انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اس سے ان کی انصاف پسندی ظاہر ہے۔

اپنے عالمانہ دیباچے میں شیرانی صاحب نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ تذکرہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب ''آب حیات'' کا ایک اہم ماخذ ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں ''آب حیات'' کے کئی اندراجات کا ذکر کیا ہے مثلاً ولی اور ناصر علی کے درمیان شاعرانہ تعلّی کا قصہ، شاہ مبارک آبرو کے حالات اور اشعار، مکھن پاکباز کا ذکر، شیخ شرف الدین مضمون کا حال اور اشعار، آرزو کا ذکر اور اشعار، آرزو کی بدیہہ گوئی، محمد شاکر ناجی کے حالات اور نادرشاہ کے حملے سے متعلق ان کے خمسے کے دو بند اور اشعار۔ شاہ حاتم اشرف علی خاں فغاں اور دیگر کے حالات و اشعار۔ سودا کا لطیفہ قائم علی امید وار کے ساتھ، بقاء اللہ خاں بقا کے حالات اور میر کی ہجو میں اشعار وغیرہ

''مجموعۂ نغز'' دو حصوں میں تھا، شیرانی صاحب نے دونوں حصوں کو یکجا کر دیا ہے لیکن ان کی جداگانہ حیثیت باقی رکھی ہے۔ پہلے حصے میں 376 اور دوسرے حصے میں 404 شعرا کا ذکر ہے۔ اس اہم کتاب کا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بورڈ نے 1973 میں شائع کیا تھا، 2002 میں اسی کو دوبارا شائع کیا گیا ہے۔

جوش ملیح آبادی—— شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود
صفحات: 107، قیمت: -/38 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
مبصر: عبید الرحمٰن

زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جوش کا سفر زندگی پہلا باب ہے جس میں مصنف نے جوش کی تاریخ پیدائش پر بحث کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا ہے اور اس سلسلے میں کئی مستند حوالے پیش کیے ہیں۔ اس باب میں جوش کو ان کے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور قدرے تفصیل سے ان کے خاندانی حالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہاں ان عوامل پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جن کی وجہ سے جوش کے مزاج اور طبیعت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ بدلتے ہوئے حالات کے اثرات جوش پر کس طرح مرتب ہوئے ان کے تجزیہ کے لیے مصنف نے ان کی مختلف نظموں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔

دوسرے باب ''جوش کے ادبی سرمائے کا تعارف'' میں جوش کی غزل گوئی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پھر نظموں کی طرف جوش کے مائل ہونے کے اسباب بیان ہوئے ہیں اور ان کی چنندہ نظموں پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کے مختلف مجموعۂ کلام کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس باب کا ایک چھوٹا سا حصہ جوش کی رباعیات کو بھی محیط ہے۔

''جوش کی شاعری میں رومانی عناصر'' کتاب کا ایک اہم باب ہے۔ یہاں اصل گفتگو شروع کرنے سے قبل رومانی شاعری اور شعرا کی تاریخ بیان کی گئی ہے تاکہ جوش کی رومانی شاعری کا منظر نامہ واضح ہو سکے۔ جوش کی مختلف نظموں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جوش پوری طرح ایک رومانوی فن کار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کے یہاں وطن سے محبت اور آزادی کا تصور اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے کہ یہ خوبی رومانویت کے لیے ضروری قرار دی گئی ہے۔

اردو میں ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں جوش کا کتنا حصہ ہے اس کو واضح کرنے کے لیے ایک باب بہ عنوان ''جوش بہ حیثیت ترقی پسند شاعر'' شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ترقی پسند ادبا و شعرا کی تحریروں سے اقتباسات کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جوش ترقی پسند تحریک کا ایک انتہائی اہم حصہ رہے ہیں۔

آخر میں جوش کے شاعرانہ کمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں بھی جوش کی شاعری کے حوالے سے دانشوروں کی آرا نقل کی گئی ہیں ساتھ ہی جوش کی غزلوں، نظموں اور رباعیات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب مختصر ہے لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ ان صفحات میں جوش جو غزل کی روایت کی چھٹی کڑی کے طور پر جانے جاتے ہیں، ان پر سیر حاصل گفتگو ہو پاتی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اس کتاب سے مختصر طور پر ہی سہی جوش کی شخصیت اور فن کے رموز و نکات سے قاری کو واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ بنیادی نوعیت کا کام ہے جس سے جوش کی حیات اور شاعری پر کام کرنے والے طلبہ یا آنے والی نسلیں ضرور استفادہ کریں گی۔ مصنف اس کاوش کے لیے قابلِ مبارک باد ہے ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی کہ اس نے ایسی بنیادی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

صوبائی خودمختاری کی ابتدا/ بشیشور پرشاد

مترجم: ایس۔ ایل۔ گوہر
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
صفحات: 302، قیمت: -/121 روپے
مبصر: ایس۔ اے۔ رحمٰن

ہندوستان کی جدید آئینی تاریخ کے موضوع پر بشیشور پرشاد کی یہ کتاب انگریزی میں 1941 میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ قومی اردو کونسل نے پہلی بار 1979 میں شائع کیا تھا اور زیر تبصرہ کتاب اس ترجمے کی دوسری طباعت ہے۔ بقول مصنف جب یہ کتاب لکھی گئی تو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نافذ نہیں ہوا تھا اس لیے اس تصنیف میں لامرکزیت کے ارتقا کی تاریخ صرف 1919 تک ہی بیان کی گئی ہے۔ جب پہلی بار اور محدود پیمانے پر صوبائی شعبوں میں حکومت کے بعض اختیارات عوامی کنٹرول میں دیے گئے اور اس اقدام کے بعد 1935 میں کامل صوبائی خودمختاری معرضِ وجود میں آئی لیکن انگریز حکمرانوں نے اپنی اس 'عنایت' پر کچھ پابندیاں بھی عائد کی تھیں۔ ان پابندیوں کی وجہ سے صوبائی خودمختاری کے 'کامل' ہونے پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے ہندوستان کی رائے عامہ مطمئن نہیں ہوئی اور پھر دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اس نظام کے نقائص کھل کر سامنے آ گئے جس کی وجہ سے جنگ آزادی تیز ہو گئی اور 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہو گیا آئین کی تشکیل کے بعد 26 جنوری 1950 کو ملک ایک جمہوری مملکت بنا اور جنگ آزادی کے ایک رہنما ڈاکٹر راجندر پرساد پہلے صدر

جمہوریہ ہوئے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن تو اس وقت تک کے حالات پر تھا جب 1935 کا ایکٹ نافذ نہیں ہوا تھا آزادی کے بعد کے ایڈیشن میں مصنف نے ایک تمہید کا اضافہ کر کے آئین ہند کی تشکیل اور 1950 میں جمہوریت کے نفاذ تک کا جائزہ پیش کیا ہے۔ بقول مصنف: ''سیاسی اداروں میں جمہوریت کے عمل کا آغاز 1919 میں اور اس کا انجام 1947 میں ہندوستان کے لوگوں کی آزادی اور ان کے اقتدار اعلیٰ کے تسلط کی صورت میں ہوا۔'' گویا عمل خود مختاری کی ابتدا 1919 میں ہوئی تھی اور اختتام 1950 میں آئین ہند کے نفاذ کے ساتھ ہوا۔ جدید آئینی تاریخ اور سیاسیات کی اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کے لیے یہ ایک اہم درسی کتاب ہے جو موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے 1853 سے 1950 تک کے سیاسی حالات اور اتار چڑھاؤ سے واقفیت کا وسیلہ ہے۔ کتاب کا ترجمہ نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ کتاب نو ابواب میں تقسیم ہے جس میں 'تمہید' کے اضافے کو دسواں باب کہا جا سکتا ہے۔

کھلی کتاب/ عابد سہیل

قیمت: -/160 روپے صفحات: 208
ناشر: عابد سہیل، 22 ایس پی، چتھن وہار، سیکٹری، علی گنج، لکھنؤ 24
مبصر: جاوید رحمانی

عابد سہیل کا نام فکشن اور فکشن کی تنقید میں کافی اہمیت رکھتا ہے ''کھلی کتاب' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس میں پندرہ خاکے ہیں جو ان شخصیات سے متعلق ہیں جو ادب صحافت اور سیاست سے وابستہ تھیں۔ اور ساری عمر اپنے اس جنون کی نذر کر دی جو آج شوق فضول سمجھا جاتا ہے یہ ادبی صحافت اور سیاست کے زندہ کردار ہیں جن کو اجتماعی حافظہ فراموش کرتا جا رہا ہے۔ ان شخصیات میں جو دلآویزی ہے، جو تہذیبی رچاؤ ہے اور جو تابناکی ہے وہ عابد سہیل کے ہر لفظ سے جھلکتی ہے پہلا خاکہ ڈاکٹر عبدالعلیم کا ہے جس میں ان کی شخصیت کا جلال اور جمال سمٹ آیا ہے دوسرا خاکہ حیات اللہ انصاری کا ہے جس میں انھیں بطور صحافی پیش کیا گیا ہے بطور فکشن رائٹر نہیں۔ اور اردو صحافت کو جو وقار حیات اللہ انصاری نے بخشا اس کا کسی قدر احاطہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''صف اول کے صحافی، ناول نگار اور افسانہ نویس اور اپنے خوابوں کو سرد منطق سے بکھیر دینے والے حیات اللہ انصاری ایک مجموعۂ اضداد شخصیت کے مالک ہیں۔''

اس کتاب کا بہترین خاکہ وہ ہے جو ''ایم۔ چلپتِ راؤ'' پر لکھا گیا ہے اس میں ایم چلپتِ راؤ کی انانیت اور انکسار نے عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے اور اس پر مستزاد نیشنل ہیرالڈ سے ایم سی کی محبت، جو جنون کی حد تک تھی۔ اسی جنون کا کرشمہ وہ نیشنل ہیرالڈ تھا جس کے بارے میں پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ ''لوگ کہتے ہیں نیشنل ہیرالڈ میرا اخبار ہے لیکن یہ اصل میں چلپتِ راؤ کا ہے' اردو کی نئی نسل ایم چلپتِ راؤ کو بھولتی جا رہی ہے اور شاید انگریزی صحافت میں بھی ان کی بے لوث خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کے بعد آل احمد سرور کا خاکہ ہے جس میں ان کی باغ و بہار شخصیت سمٹ آئی ہے بقول عابد سہیل ''سرور صاحب فنا فی التصنیف ضرور تھے لیکن مجلسی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے' اور اسی مجلسی زندگی کو اس خاکے میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی دلآویزی میں کلام نہیں۔ پانچواں خاکہ پنڈت آنند نرائن ملا کا ہے جو شاعر تو اچھے نہیں لیکن — ''اردو ملا صاحب کا جزو ایمان تھی'۔ عشرت علی صدیقی اس ''قومی آواز'' کے روح رواں تھے جن کے بارے میں عابد سہیل نے لکھا ہے ''اس زمانے میں شہر کے ادیبوں کا ایک کعبہ قومی آواز بھی ہوا کرتا تھا'' عشرت علی صدیقی قومی آواز کے مقبول کالم نگار ہی نہیں تھے بلکہ'' اخبار نکالنے کی ذمے داری عشرت صاحب کی تھی، حیات اللہ صاحب کی نہیں اور عشرت صاحب صحافی تھے اور صرف صحافی بلکہ فنا فی الصحافت جب کہ حیات اللہ صاحب سیاستداں بھی تھے ادیب بھی، پیراک بھی اور مولوی بھی۔ ان دونوں کی جانب میرا رویہ کچھ اس قسم کا تھا۔ با خدا دیوانہ باشد، با محمد ہوشیار'' عشرت صدیقی کا خاکہ بھی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا بہترین خاکہ'' اولڈ انڈیا کافی ہاؤس' ہے جس میں اس عہد کا لکھنؤ اپنی تمام دلآویزی و رعنائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

خاکہ نگاری چوں کہ جیتی جاگتی شخصیت اور مصنف کے درمیان کشاکش کی بھی ایک صورت ہے۔ ایک بات یہ ضرور کھٹکتی ہے کہ ان شخصیات کی کمزوریوں سے چشم پوشی کی گئی ہے حالانکہ عابد سہیل انگریزی مقولے A man is remembered by his weaknesses. کے حوالے سے لکھتے بھی ہیں کہ ''شخصیت کی تعمیر میں انسانی کمزوریوں کا عمل دخل خوبیوں سے شاید کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے کسی بھی شخصیت کی کمزوریوں کو پس پشت ڈال دیجیے، ساری عمارت بکھر جائے گی، جیسے بھربھری مٹی کی بنی ہو''

مختصراً یہ کہ 'کھلی کتاب' میں شامل جملہ خاکے متعلقہ شخصیات کے احوال و کوائف پر مکمل اور جامع تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔

غزل کی تنقید کی اصطلاحات/ظہیر رحمتی

قیمت:-/250روپے صفحات:492

ناشر: مصنف، 160، اترا کھنڈ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ 67

مبصر: فاروق انصاری

صنفِ غزل اور غزل گو شعرا پر بحث کرتے وقت ناقدین نے بہت ساری اصطلاحات وضع کی ہیں۔ 'غزل کی تنقید کی اصطلاحات' میں مصنف نے اردو غزل کے حوالے سے تین سو اصطلاحات جمع کی ہیں۔ انھوں نے ان اصطلاحات کی تشریح و تفسیر مع امثال درج کر کے اردو شاعری کے محققین اور ناقدین کی مشکلات کو کافی حد تک آسان بنا دیا ہے۔

پیش لفظ میں مصنف نے اصطلاح کی تعریف اور تنقیدی اصطلاح کے معنی و مفہوم کی وضاحت سے بحث کرتے ہوئے اصطلاح سازی کے تعلق سے مولانا وحید الدین سلیم کی تصنیف 'وضع اصطلاحات' افتخار حسین کی 'تلمیحات و مصطلحات' حامد حسین جیلانی کی 'اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات' ابوالاعجاز کی 'کشاف تنقید اصطلاحات' پروفیسر عتیق اللہ تابش کی 'ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ' اور سلیم شہزاد کی 'فرہنگ ادبیات' کو شامل کیا گیا ہے۔ 'غزل کی تنقید کی اصطلاحات' قدیم و جدید اصطلاحات سے لے کر دور حاضر کی ان اصطلاحات کا احاطہ کرتی ہے جن کا تعلق اہم ادبی رجحانات اور تنقیدی میلانات سے ہے۔

مصنف نے تمام اصطلاحات کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ ہر اصطلاح کے لغوی معنی اور اصطلاحی مفہوم کے علاوہ اساتذۂ کرام کے اشعار بھی مع امثال پیش کیے ہیں جو متذکرہ اصطلاحات کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ مثال کے طور پر 'تصور' کے ضمن میں یہ عبارت ملاحظہ کریں:

'' تصور عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں دھیان، خیال۔ تصور فلسفہ، منطق، نفسیات اور شعری تنقید کی اصطلاح ہے جو اردو میں عربی و فارسی زبانوں کے ذریعے رائج ہے......

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

(غالب)

اس شعر میں غالب نے موت کے بعد کی رسوائی سے بچنے کے لیے غرق دریا ہونے کا خیال باندھا ہے۔ اب اگر اس خیال کو غالب کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ خیال تصور ہو جائے گا اور اس کو محض وقتی بیان اور کیفیت سمجھا جائے تو یہ بات محض خیال رہے گی۔'' (ص 162-159)

مزید'' زور'' کے ضمن میں یہ تحریر ملاحظہ کریں:

'' زور فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی طاقت، قوت کے ہیں۔ زور تذکروں کی اصطلاح ہے۔ اصطلاح میں زور بیان کی وہ خاصیت ہے جو شاعر کے مطمح نظر کو پوری قوت کے ساتھ سامع و قاری پر ظاہر کرتی ہے۔ یعنی شاعر جس خیال، جذبہ یا منظر کو پیش کرنا چاہتا ہے وہ اس طرح شعر میں ادا ہو کہ قاری و سامع کو شاعر جتنا متاثر اور متحرک کرنا چاہتا ہے وہ اتنا متاثر اور متحرک ہوں..... مثال:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے (مومن)

(ص 307-305)

مجموعی اعتبار سے'' غزل کی تنقید کی اصطلاحات'' اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ بطور خاص اردو طلبہ کے لیے اردو شاعری کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگا۔

□□□

اردو ہماری زبان ہے، اردو ہماری تہذیب ہے۔
اردو کتب، رسائل اور اخبارات خرید کر پڑھیں۔
اردو بولیے، اردو پڑھیے، اردو لکھیے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیجیے

مصنف: جے شری پلائی
بچوں کا گوشہ
”ہمارے رہنما“ سے ماخوذ

مترجم: صفدر نقوی

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ”ہمارے رہنما“ جلد ہشتم سے جگدیش چندر بوس کے احوال و کوائف اور تحقیقی کارنامے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام قومی رہنماؤں کی حیات و خدمات سے واقف کرایا گیا ہے جنھوں نے ملک و قوم کی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ”ہمارے رہنما“ کی اس جلد میں بپن چندر پال، کستوربا گاندھی، وٹھل بھائی پٹیل، رفیع احمد قدوائی، ونوبا بھاوے، شیاما پرساد مکرجی اور ہومی جہانگیر بھابھا سے متعارف کرایا گیا ہے۔ 161 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/35 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جگدیش چندر بوس

انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہمارے ملک میں ایک زبردست سائنس داں پیدا ہوئے۔ جگدیش چندر بوس۔ انھوں نے علم طبعیات، علم نباتات اور علم عضویات پر معمولی آلات کے ساتھ بہت دور رس تجربات کیے۔ انھوں نے پودوں، حیوانات اور دھاتوں میں جو بنیادی یکسانیت ہے اس کو ظاہر کیا۔ انھوں نے ہندوستان کو دنیا کے سائنس داں ملکوں میں جگہ دلائی۔ موجودہ زمانے میں ان کی انقلابی سائنسی تحقیقات نے اتنا اثر ڈالا تھا کہ لندن کا ٹائمز اخبار تک چپ نہ رہ سکا۔ یہ اخبار عام طور پر معمولی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس اخبار نے لکھا تھا۔ ”اب بھی ہم انگلستان میں وحشیانہ زندگی کے تجربات میں ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ایک ہوشیار مشرقی نے اس کائنات کو فتح کر کے ایک رشتے میں پرو دیا ہے۔ اس نے ان بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں دنیا کو دیکھا ہے۔“

بچپن:

جگدیش چندر بوس 30 نومبر 1958 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین باما سندری بوس اور بھگوان چندر بوس تھے۔ ان کی پیدائش میمن سنگھ میں ہوئی تھی۔ جہاں ان کے والد نائب منصف کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کے والد نظم و ضبط کے پابند اور انصاف پسند تھے۔ ان کا دردمند دل انھیں سب کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا تھا یہاں تک کہ ان لوگوں کو جنھیں مجرم کہا جاتا تھا اور اپنے ماتحتوں کے لیے بھی وہ فکرمند رہتے تھے۔ جگدیش بچپن ہی سے اپنے والد کی شرافت سے بہت متاثر تھے۔

حکومت کے ملازم اپنے بچوں کو بہت مشہور اسکولوں میں داخل کراتے تھے، جن میں ذریعۂ تعلیم انگلش تھا۔ لیکن بھگوان چندر بوس نے اپنے بچے کو ایک مقامی اسکول میں داخل کرایا۔ اس سے پہلے کہ بچہ کوئی غیر ملکی زبان سیکھے وہ اپنی مادری زبان سیکھنی ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ جو شخص اپنی تہذیب اور وراثت کو نہ سمجھے گا وہ کسی غیر ملکی تہذیب اور اس کی خصوصیات کو ہرگز نہ سمجھ پائے گا۔

جگدیش کے ساتھ کھاتے پیتے گھروں کے نازک سے لڑکے نہیں تھے۔ وہ مزدوروں، کسانوں، مچھیروں اور مسلمان لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ فطرت کی گود میں پلنے والے یہ بچے انھیں گہرے سمندر، چڑیوں، پودوں اور جانوروں کے قصے سناتے تھے۔ جگدیش ان قصوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس سے ان کے دل میں فطرت کی چھپی ہوئی باتوں کے بارے میں کھوجنے اور سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے ان سے آدمی اور آدمی کے درمیان صحیح رشتوں اور فطرت سے اس کے بہت قریبی تعلق کو سیکھا۔

جگدیش چندر بوس نے دیویکانند کے اس بیان کو صحیح ثابت کر دکھایا کہ ''تعلیم وہ سائنس ہے جو بچے کے فطری اور سماجی ماحول کے تعلق اور اثر سے اس کی اندرونی صلاحیتوں کو روبہ کار لاتی ہے۔'' انھوں نے معمولی نلکیوں اور آسانی سے مہیا ہونے والے سامان سے باغیچے کو پانی دینے کی ترکیب کی۔ اس سے ان کی کم عمری میں، سیدھے سادے اوزار بنانے کی صلاحیت ظاہر ہوئی اور انھی چیزوں سے انھیں آئندہ کی تحقیق میں بہت مدد ملی۔

جگدیش اکثر اسکول سے واپسی پر اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لے آتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ بچے بھی ہوتے تھے جنھیں نیچی ذات کا کہا جاتا تھا۔ ان کی والدہ ان کے دوستوں سے بہت شفقت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ اس سے ان کی کھلے ذہن کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے والدین کی اسی دانش مندی کے نتیجے میں جگدیش کو اپنی آئندہ زندگی میں بنیادی قدروں کو کھوئے بغیر نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اپنی ابتدائی زندگی میں ان کے دل میں غریب لوگوں کے لیے بہت ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ہمدردی صرف اوپری نہ تھی بلکہ ہر شخص کو سنجیدگی کی نگاہ سے دیکھ پرکھ کر اس کی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اور اس میں نسل، ذات یا برادری کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔

ان کی ہمدردیاں اور محبت ہندوستان کی مشہور رزمیہ نظموں کے ہیرو کے ساتھ بھی تھیں۔ مہابھارت میں وہ کرن کی مصیبتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ حالانکہ کرن کا کردار دیوتاؤں جیسا تھا، پھر بھی بدقسمتی سے حالات نے ان کی زندگی کو نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ جگدیش چندر بوس نے اپنے شاعر دوست رابندر ناتھ ٹیگور سے درخواست کی کہ وہ ایک نظم کے ذریعے کرن کو لافانی بنا دیں۔ ٹیگور نے ''کرن کنتی سمواد'' کے نام سے ایک نظم بھی لکھی۔ اس میں کرن کے بارے میں جگدیش چندر بوس کی رائے جھلکتی ہے۔

تعلیم:

نو برس کی عمر میں جگدیش چندر بوس نے ہرے اسکول، کلکتہ میں اور بعد میں سینٹ زیویر اسکول میں داخلہ لیا۔ سینٹ زیویر خصوصی طور پر یوروپی یا انگلو انڈین لڑکوں کے لیے تھا۔ انھیں وہاں اپنے ساتھیوں کی تنگ نظری اور سخت باتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جگدیش کو اپنے اوپر زبردست اعتماد تھا۔ انھوں نے زندگی کو ایک چنوتی کے طور پر قبول کر لیا۔ جہاں رکاوٹیں آتی ہیں لیکن ان پر ایک یقین اور اعتماد کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ فطرت سے مستقل محبت نے انھیں ایک زبردست ذہانت کا مالک بنا دیا تھا۔

مستقبل کا ایک فطرت پرست اور سائنس داں ان کے اسکول کے زمانے کی دلچسپیوں اور مشغلوں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ ان کا تمام فاضل وقت اور رقم دونوں پالتو جانوروں اور چھوٹے سے باغیچے کے رکھ رکھاؤ پر خرچ ہوتے تھے۔

1880 میں جگدیش چندر بوس ڈاکٹری (میڈیسین) کی تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ لیکن قسمت نے ان کے لیے دوسرا ہی پروگرام بنا رکھا تھا۔ تعلیم کے پہلے ہی سال میں وہ کالا آزار میں بیمار پڑ گئے اور صحت کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنی پڑی۔ اب انھوں نے کیمبرج کے کرائسٹ کالج میں نیچرل سائنس میں داخلہ لیا۔

ان کے دو استادوں نے انھیں بہت متاثر کیا۔ اور ان کی ذہانت کو تجرباتی اور تحقیقاتی سائنس کے راستے پر لگا دیا۔ ان میں سے ایک تھے علم طبعیات کے لارڈ ریلے اور دوسرے پروفیسر سڈنی وینس، ماہر علم نباتات ان دونوں نے جگدیش کے شوق اور لگن کو بڑھانے میں بہت دلچسپی لی۔

پروفیسر شپ:

جگدیش چندر بوس 1885 میں ہندوستان واپس آئے۔ پریسی ڈنسی کالج کلکتہ میں علم طبعیات کے قائم مقام پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اسی زمانے میں اس اصول پر ایک قاعدہ بنایا گیا کہ یوروپی صرف اپنے یوروپی ہونے کی وجہ سے کسی بھی کام کے لیے بالکل ٹھیک مانا جاتا تھا، لیکن ایک ہندوستانی صرف ہندوستانی کی حیثیت سے یوروپی کے برابر مستعد نہیں تھا۔ اس لیے یوروپی اور ہندوستانی برابر تنخواہ کے مستحق نہ تھے۔ ہندوستانی، یوروپی کے مقابلے میں صرف دو تہائی تنخواہ کا مستحق تھا۔ بوس کو دو تہائی کی بھی آدھی تنخواہ ملتی تھی۔ کیونکہ وہ صرف قائم مقام پروفیسر تھے۔ بوس اپنی قومیت پر فخر کرتے تھے، ان کی خودداری نے یہ توہین برداشت نہ کی۔ انھوں نے تنخواہ قبول نہ کی اور تین سال تک اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ حالانکہ وہ اور ان کا خاندان اس عرصے میں سخت مالی پریشانی میں مبتلا رہے۔

ذہنی آزادی کا یہ مضبوط جذبہ ان کے کردار کی بنیاد تھا۔ کئی سال بعد 1913 میں انھوں نے اس مسئلے پر پبلک سروس کمیشن کے سامنے ہندوستانیوں کے ساتھ اس فرق کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ اس وقت تک وہ عالمی شہرت والی شخصیت بن چکے تھے۔ نام اور شہرت کی وجہ سے انھیں خود کو اپنے ہم وطنوں میں شامل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

1887 کے شروع میں انھوں نے ابلا داس سے شادی کی۔ وہ ایک مشہور وکیل درگا موہن داس کی بیٹی تھیں۔ یہ دیش بندھو چترنجن داس کے چچا کے لڑکے تھے۔ ابلا داس اس وقت مدراس میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ انھوں نے پڑھائی چھوڑ دی تاکہ شوہر کے ساتھ مستقل طور پر رہ سکیں۔ انھوں نے مشکلوں کے پورے زمانے میں بوس کا ساتھ دیا۔ ان کی پرسکون فطرت نے بوس کی پرجوش اور جذباتی طبیعت کو متوازن رکھا۔ ان کے

اکلوتے دودھ پیتے بچے کی موت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا۔ ابالا بوس ایک نرم دل میزبان اور سرگرم سماجی کارکن تھیں۔ انھوں نے ''ناری شکشا سمیتی'' بنائی۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جو بنگال میں لڑکیوں اور عورتوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے وقف تھا۔

طبعیات میں تحقیق:

پریسی ڈینسی کالج میں جگدیش چندر بوس پر تدریسی کاموں کا بہت بوجھ تھا تاہم تحقیقی کاموں سے انھیں جو لگاؤ تھا وہ اسے دیر رات تک کام کر کے پورا کرتے رہتے۔ انھوں نے بیس مربع فٹ کا ایک کمرہ بطور تجربہ گاہ استعمال کیا، خود اپنے اوزار اور آلے بنائے اور طبعیات میں اپنے کام کی ابتدا کردی۔

جگدیش چندر بوس نے 1885 میں وائرلیس لہروں کے وجود اور پھیلاؤ کی تشریح کی جس کی نشان دہی کئی دہے پہلے جیمس کلارک میکس ویل کر چکا تھا۔ الکٹرو میگنیٹک لہروں پر انگلینڈ کے سائنس داں اولیور لوج اور جرمنی کے ہائین رچ ہرٹز خاصا کام کر چکے تھے اور ان لہروں کو ''ہرٹزین لہریں'' کہا جانے لگا تھا۔

چونکہ روشنی کی لہروں سے ملتی جلتی بجلی کی لہروں کی خصوصیات کا مطالعہ زیادہ فائدے مند نہیں تھا اس لیے جگدیش چندر بوس نے ریڈیو شارٹ ویوز پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ بر خلاف ہرٹز اور لوج کے، جنھوں نے ان لہروں کو بالترتیب ڈیسی میٹر اور سینٹی میٹر میں پیش کیا تھا، بوس نے ان لہروں کی پیائش کو ملی میٹر سطح تک پہنچا دیا۔

پٹسن جیسی معمولی شے کی ریشوں کے استعمال سے بوس ایسے طریقے نکالنے میں کامیاب ہو گئے جن سے برقی لہروں میں برقی میلان کا حاصل کر لینا ممکن تھا۔ یہ ریسیورز (آواز گیر) ''کوہیررس'' کہلاتے تھے۔ بوس نے ہرٹزین لہروں کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور وہ ایک بے مثال ''کوہیرر'' بنانے کے قابل ہو گئے جسے اگر وہ چاہتے تو صنعتی فائدے کے لیے بھی استعمال کر سکتے تھے۔ دراصل 1885 کے دوران تو انھوں نے اپنی اس ایجاد کے ذریعے دنیا بھر میں، جہاں جہاز رانی ہوتی تھی، وہاں ساحلی برق کاری نظام میں انقلاب برپا کر دیا ہوتا۔ ان کے بنائے ہوئے بے مثال ریسیورز جہازوں پر رکھ دیے جاتے جو برق برق خانوں لائٹ ہاؤس سے روانہ کی گئی برقی لہروں کو حاصل کر سکتے تھے۔ بوس اپنی ایجادات سے محض علمی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے علم سے مادی فائدہ حاصل کرنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اسی زمانے میں ان کا ہم عصر مارکونی، جس نے دوسرے یورپی سائنس دانوں کے ساتھ کام کیا تھا، لمبی دوری کے ریڈیو سگنل وضع کر کے اسی میدان میں اپنے تحقیقی کارناموں کو مالی فائدہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کر چکا تھا۔

1885 میں کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں بوس نے جو مظاہرہ پیش کیا وہ وائرلیس ٹیکنالوجی کے میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود اپنے بنائے ہوئے آلات کی مدد سے انھوں نے برقی لہروں کو دو کمروں کی دیواروں سے گزارا جنھوں نے تیسرے کمرے میں داخل ہو کر ایک توپ اور ایک پستول کو داغا اور گن پاؤڈر کے ایک ڈھیر کو اڑا دیا۔

انھوں نے دوسرا بڑا زبردست کام جو 1886 میں انجام دیا وہ برقی لہروں کی ''ڈفریکشن گریٹنگ'' کے ذریعے لمبائی معلوم کرنا تھا، یعنی کسی ایسی سطح سے روشنی کو منعکس ہونے دینا جس پر قریب قریب لائنیں ہوں جو اسے اسپکٹرم میں تبدیل کر دیں۔ یہ ایک ایسا میدان تھا جس میں بہت سے ماہرین طبیعات، نے جن میں ہرٹز بھی شامل تھا متضاد یا ایک دوسرے کے خلاف نتیجے حاصل کیے تھے۔ بوس کو اس مسئلے کا حل نکالنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

شارٹ ویو ریڈی ایشن (شعاع افشانی) کے میدان میں حاصل کیے گئے شاندار کارناموں کے سبب بوس کے گہرے مطالعے کی سمت جو انھوں نے برقی لہروں میں برقی میلان سے متعلق حاصل کی تھی، اور ان کی تحقیقاتی مہارت، جو انھیں اپنے نظریات کو دکھانے کے لیے آلات بنانے میں حاصل تھی، ان سب چیزوں نے سائنسی دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور انھیں لندن یونیورسٹی کی تعریف و تحسین حاصل ہوئی۔ انھوں نے اپنا کام ایک تحقیقی مقالے کی شکل میں رائل سوسائٹی کو اشاعت کی غرض سے پیش کیا۔ یہ مقالہ اتنا معیاری تھا کہ لندن یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی اور اس کے لیے طالب علم کا آمنے سامنے امتحان، جو ایک لازمی ضرورت تھی، اسے بھی ختم کر دیا۔

1896 میں بوس یورپ کے صف اول کے سائنس دانوں سے ملنے اور ان کی تجربہ گاہوں کے متعلق معلومات اور جانکاری حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ گئے۔ جب وہ یورپ میں تھے تو انھوں نے اپنی تحقیقات پر کئی تقریریں کیں۔ ان تقریروں نے مغربی دنیا کو قائل کر دیا کہ ہندوستان نے محض غیر معمولی فلسفی ہی نہیں بلکہ بلند پایہ سائنس دانوں کو بھی جنم دیا ہے۔ فرانسیسی سائنس اکیڈمی کے صدر پروفیسر اے. کارنو نے بوس کی ستائش میں کہا۔ ''آپ کو اپنی اس نسل کی اعلیٰ قدروں کو پھر سے زندہ کرنا چاہیے جس کے ہاتھوں میں سائنس اور آرٹ کی مشعل تھی اور جو 2000 سال پہلے تہذیب کی قائد تھی۔ ہم فرانس میں آپ کو آفریں کہتے ہیں اور ہر محاذ پر آپ کے لیے کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔''

(جاری)

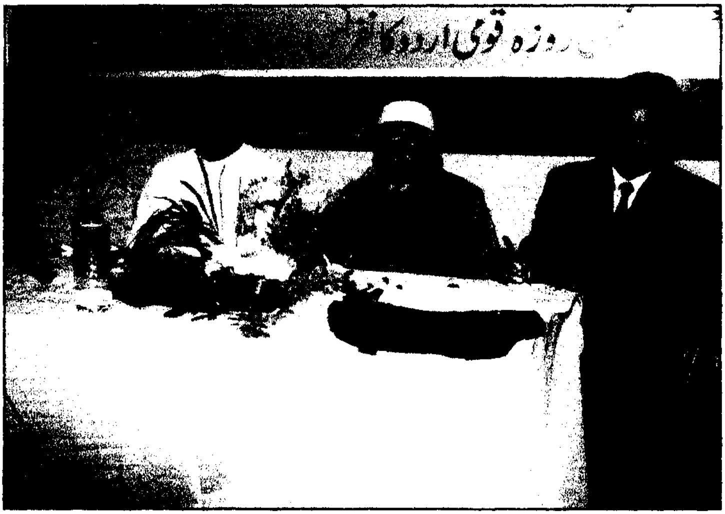

سہ روزہ اردو کانفرنس کے موقعے پر لی گئی تصویر میں: ڈاکٹر مشتاق احمد، ایڈیٹر "جہان اردو" دربھنگہ، جناب عبدالمنان طرزی، جناب سید شاہ نور الحق قادری اور جناب شاکر خلیق۔

کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں لی گئی سامعین کی تصویر۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/03/2006

URDU DUNIYA Monthly, April 2006, Vol. 8, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی جانب سے باشتراک ہریانہ اردو اکادمی 3 اور 4 مارچ 2006 کو ریاستی اردو اکادمیوں کی پانچویں کانفرنس پنجاب یونیورسٹی کے آئی سی ایس ایس آر ہال میں منعقد ہوئی جس میں ملک کی 14 ریاستی اردو اکادمیوں کے سربراہان نے شرکت کی۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر ہریانہ اردو اکادمی کی مطبوعات کا اجرا کرتے ہوئے گورنر ہریانہ عالی جناب ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی (درمیان میں) اور (دائیں سے) جناب آر ایس گجرال (آئی اے ایس) فائنانشل کمشنر اور سکریٹری برائے تعلیم ہریانہ، جناب پھول چند ملانا وزیر تعلیم ہریانہ، ڈاکٹر آر کے بھٹ پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی اردو کونسل اور جناب کشمیری لال ذاکر سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی۔

کانفرنس کے شرکا کی ایک یادگار تصویر۔

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL,
Printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published from
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor: Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938.